

TIGHT BINDING BOOK

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_I 188918

UNIVERSAL
LIBRARY

Osmania University Library

Call No. ۹۱۵۳۸۱

Accession No.

Author

س - س

سلیمان ندوی

۷۱ 432

۷۳۲

Title

سیر افغانستان -

This book should be returned on or before the date last marked below.



افغانستان

تین هم سفر

علامہ اقبال

سید سلیمان ندوی

سر راس مسعود

از
سید سلیمان ندوی

نقد و نظر اکبر الہی
دور پیچہ چودہ آنہ عیار
عابد روڈ - حیدر آباد (دکن)

طبع اول ————— ایک ہزار

مئی ۲۵ ۱۹۴۶ء 432



پروپرائٹر

چودھری محمد اقبال سلیم گاہندی

بانی

چودھری منظور الحق

مطبع

اعظم اسٹیم پریس گورنمنٹ ایجوکیشنل پریشرز
حیدرآباد دکن

بیش لفظ بیش لفظ

از مولانا سید عبدالقدوس صاحب ہاشمی

۱۹۳۳ء میں نادر شاہ شہید نے ہمارے تین بزرگوں کو کابل آنے کی دعوت
مقصود یہ تھا کہ ان بزرگوں کے گراں بہا مشوروں سے افغانستان کی ہر جہتی ترقی خصوصاً ایک
مربوط نظام تعلیم کے سلسلہ میں استفادہ کیا جائے۔ یہ بزرگ تھے۔

(۱) حکیم الاسلام حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ

(۲) حجۃ اللہ حضرت علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ العالی

(۳) مرحوم ڈاکٹر سردار اس محمود رحمۃ اللہ علیہ

اکتوبر ۱۹۳۳ء میں یہ لوگ کابل تشریف لے گئے اور صرف دو چار روز قیام پذیر رہے
بعد واپس تشریف لے آئے۔ اس مختصر قیام میں علاوہ نادر شاہ شہید کے وزراء، امراء، علماء
ور ادباء سے ملاقاتیں ہوئیں مختلف مسائل پر تبادلہ خیالات ہوئے اور افغانستان نے ان کے
نکار اور ان کی بصیرتوں سے بیش از بیش فائدہ حاصل کیا۔

اہل وطن نے امید کی تھی کہ یہ بزرگ افغانستان سے ہمارے لئے کیا
میل لائے ہیں، پٹان کے انگوڑ اور قندھار کے انار سے لذت کام و دہن کے سوا کیا حاصل تھا
میں انہوں نے سندی شیرازی کی طرح اہل وطن کے لئے ”سمنہائے شیریں“ کا تحفہ پیش کیا
اور حق یہ ہے کہ اس سے بہتر کوئی اور تحفہ نہیں ہو سکتا تھا۔ علامہ اقبالؒ نے اپنی معروف
”شمنوی“ مسافر“ لکھ کر پیش کی جو اس سیاحت چند روزہ پر ان کے شاعرانہ جذبات اور

حکیمانہ خیالات کا مجموعہ ہے، خیبر، سرحد، کابل، غزنین اور قندھار کے غیرت انگیز مناظر و مقابر پر شاعر کے آنسو ہیں اور بابر، محمود غزنوی، علیم سانی اور احمد شاہ درانی کی خاموش تربتوں کی زبان حال سے سوال و جواب ہیں۔
 — اور حضرت الاستاذ علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ نے یہ بیش بہا مضامین پیش کئے جو ۱۹۲۵ء کے رسالہ معارف میں مسلسل شائع ہوتے رہے ہیں اور شاید آج پہلی بار کتابی شکل میں شائع ہو رہے ہیں۔ ان میں سوانح بھی ہیں اور تذکرے بھی، احوال بھی ہیں، اور افکار بھی، تاریخی اسناد بھی ہیں اور جغرافیائی معلومات بھی، مدارس و معابد کا حال بھی ہے اور اخبارات و رسائل کی فہرست بھی۔ ان تحفوں سے بہتر ہمارے لئے اور کیا ہو سکتا تھا؟

دنیا میں حوادث و واقعات ہوتے ہی رہتے ہیں، تاریخی یادگاروں اور اثری نشانات پائے ہی جاتے ہیں، لیکن ہر شخص کو اقبال اور سلیمان ندوی کی آنکھیں کہاں ملتی ہیں؟ گلاب ہر چمن میں اور ہر صبح کھلتا ہے لیکن ہر شخص اس ”ورق معرفت کرو گار“ کو کہاں پڑھتا ہے۔ آفتاب ہر روز سر شاہ دامن مغرب میں غروب ہوتا ہے لیکن خلیل علیہ السلام کی طرح ”انی لا احب الا فلیں“ کا نعرہ توحید کون لگاتا ہے؟ — بالکل اسی طرح سفر و سیاحت سے ہر شخص یکساں استفادہ نہیں کرتا، اور دوسروں کو اس سے فائدہ پہنچانا تو بڑی بات ہے یہ ”رتبہ بلند“ جسے مل گیا، مل گیا خدا کی دین

ان مضامین کو پڑھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ علامہ مدظلہ نے اس روروی میں بھی افغانستان اور اس کے تاریخی آثار کو کس دقت نظر سے دیکھا ہے اور کس خوبی کے ساتھ اسے اپنے دیعہ علمی مطالعہ کے گل بوٹوں سے سجا کر پیش کیا ہے، اس کی داد دینا اپنے لئے ”تو چھوٹا منہ بڑی بات“ ہوگی پڑھنے والے خود اندازہ لگائیں گے۔ انداز تحریر اس قدر صاف اور بے تصنع ہے کہ بلا مبالغہ پڑھنے والا سارے سفر نامہ میں اپنے آپ کو شریک سفر سمجھتا ہے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب قبلہ انگلی پکڑے ساتھ ساتھ لئے پھر رہے ہیں۔ اور بتاتے جا رہے ہیں کہ یہ دیکھو! سامنے جو شہر نظر آتا ہے غزنین ہے۔ یہیں سلطان محمود غزنوی رہتا تھا، اور اس بعد سنہ وار واقعات تاریخی مع تفصیل اسماء و نین بتاتے جاتے ہیں آخر میں فرماتے ہیں کہ عباس غوری کی دسویں پشت میں علاء الدین حسین پیدا ہوا جس نے اپنے بھائی سیف الدین کے انتقام میں اس شہر کو جلا کر خاکستر کر دیا اور زبان خلع سے ”جہاں سوز“ کا لقب پایا۔ اس کے بعد علاء الدین جہاں سوز کا لکھا ہوا فخریہ سناتے ہیں اتنے میں شہر غزنین اور قریب آ جاتا ہے، اور قدیم غزنین کو چھوڑ کر جدید غزنین کی آبادی سے متعلق تاریخی حقائق بیان فرماتے ہیں، احمد شاہ ابدانی کا ذکر ہوتا ہے، ان کے جانشین تیمور شاہ کا نام آتا ہے، بتاتے ہیں کہ جدید غزنین اسی کی تعمیر ہے۔ حکیم سنائی کا مقبرہ آتا ہے، اقبالؔ ہزار کے سرھانے کھڑے ہوئے دور ہے ہیں، اور زور زور سے رونے کی آواز آتی ہے

سید صاحب قبلہ بھی متاثر آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ اور مزار کا کتبہ پڑھ کر بتاتے ہیں کہ اس کتبہ سے دھوکا نہ کھانا یہ وفات کے بہت دنوں بعد کا لگایا ہوا ہے، اور شاید اس میں تاریخ غلط درج ہو گئی ہے۔ صحیح تاریخ وفات یہ ہے۔ یہاں سے نکل کر سلطان محمود کے مزار پر جاتے ہیں، راہ میں سواروں کا ایک دستہ ملتا ہے۔ اس سلسلہ میں موجودہ مسلمانان عالم کا ذکر ہو جاتا ہے۔ مزار پر کتبہ پڑھ کر بتاتے ہیں اور فرخی سیستانی مشہور مرثیہ بھی سناتے جاتے ہیں۔

شہر غزنین نہ ہماں است کہ من دیدم پار
چہ فتاد است کہ اسال و گرگوں شد کار
غرض کہ پڑھنے والا ایسا محسوس کرتا ہے کہ ایک ماہر فن و دانائے روزگار استاد اپنے شاگرد کو ساتھ لئے ہوئے سفر کر رہا ہے، اور آثار کی تحقیق و تاریخ کے ساتھ ساتھ مزید مطالعہ کے لئے کتابوں کے نام بھی بتاتا جاتا ہے۔

جج کے سفرنامہ ہائے سعادت کے علاوہ غالباً اردو زبان میں وہ سب سے پہلا سفرنامہ جسے علمی مطالعہ کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے۔ علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کا "سفرنامہ روم و شام" ہے۔ اور آج اس مختصر سی کتاب کو مطالعہ کرنے کے بعد آپ بے اختیار کہہ اٹھیں گے کہ علامہ شبلی نعمانی کے دو سرے کا زمانوں کی تکمیل کی طرح اس کی تکمیل بھی

ان کے جانشین اور ہماری قوم و زبان کے عظیم المرتبت محسن کے ہاتھوں ہو رہی ہے۔ اور یہ یقین اور بھی پختہ ہو جائے گا کہ علامہ سید سلیمان ندوی مدظلہ نے جن کا ایک ایک لمحہ طالبان علم اور تشنگان معارف کی خدمت میں بسر ہوتا ہے، افغانیوں کی خدمت کے لئے جب کابل گئے اس وقت بھی اُردو بولنے والوں کو فراموش نہیں کیا۔

اللّٰهُمَّ مَتِّعْنَا بِطَوْلِ بَقَائِهِ وَكَثْرَةِ امثالِهِ

عبدالقدوس ہاشمی
دارالسلام - حیدرآباد دکن

سفر افغانستان

ممالک اسلامیہ کی سیر و سیاحت کے سلسلہ میں مدت سے آرزو تھی کہ کم از کم قریب ترین ہمسایہ اسلامی ملک افغانستان ہی کو دیکھ لوں۔ ۱۹۲۷ء میں جمعیۃ العلماء پشاور کی شرکت کے زمانہ میں دو دفعہ درہ خیبر کی سیاحت کی ایک دفعہ اس مختصر سفر کے رفیق مولوی ظفر علی خاں صاحب اور مولانا حسین احمد صاحب تھے اور دوسری دفعہ مولانا محمد علی اور جناب شعیب صاحب قریشی دونوں دفعہ لنڈی کوتل کے قلعہ سے آگے بڑھنا نصیب نہ ہوا پہلی دفعہ واپسی پر اتنی دیر ہوئی کہ شہر پشاور کا پچانگ بند ہو گیا اور رات جبرود کی سرائے میں قرون وسطیٰ کے مسافروں کی طرح بسر ہوئی اور دوسری دفعہ لنڈی کوتل کے مشہور شنواری رئیس کے یہاں دن بھر قیام رہا۔

اس اچھٹے ہوئے جلوہ دیدار نے آتشِ شوق کو تیز کر دیا تھا پچھلے ہی موسم گرما میں جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب سے ”نا قابلِ شکست عہد“ ہوا تھا کہ آئندہ سال افغانستان کی سیر کی جائے ابھی اس گرمی پر پوری سردی آنے

نہ پائی تھی کہ خود ”کوہ طور“ سے طلب دیدار کی صدا بلند ہوئی۔

ڈاکٹر سراجیال کا نوازش نامہ آیا کہ حکومت افغانستان نے مجھے اور سر اس مسعود اور آپ کو اپنے ہاں کے بعض علمی و تعلیمی مسائل میں مشورہ کی غرض سے بلانا چاہا ہے، کیا آپ چلنے کو تیار ہیں؟ میں نے جواب دیا کہ اس ملک کی جو خدمت مجھ سے بن آئے ہیں اس کے لئے تیار ہوں، اس کے بعد ۷ اکتوبر کو ہزار کسٹنسی صلاح الدین سلجوقی جنرل قونسل افغانستان کا خط آیا جس میں اسی مطلب کا اظہار تھا، میں نے ان کو بھی اپنی آمادگی کی اطلاع دی جنرل قونسل صاحب کی اصل تحریک تو یہ تھی کہ ہم لوگ ۱۳ اکتوبر کے جشن استقلال کے موقع پر کابل پہنچ جائیں، مگر اس قدر جلد پاسپورٹ کا ملنا ممکن نہ تھا، اس لئے تاریخ کی تعیین کا مسئلہ پاسپورٹ کے ملنے کے بعد رفتار کے مشورہ پر موقوف رہا۔ ترقی تھی کہ ۹ اکتوبر کو پاسپورٹ مجھے مل جائے گا اور اُدھر سر اس مسعود صاحب کو یونیورسٹی کی مشغولیتوں کے سبب سے جلد واپسی کی عجلت تھی، اگر تک ان صاحبوں کو پاسپورٹ مل گئے اور ۲۰ م کو لاہور سے اور ۲۱ م کو پشاور سے روانگی کا پروگرام بن گیا اور وہ اسی کے مطابق روانہ ہو گئے میری نسبت دفتری تحقیقات کا سلسلہ شروع ہو گیا اور بالآخر ۱۸ م کو نینی تال میں اس پر دستخط ہوئے اور ۲۱ م کو وہ اعظم گڑھ پہنچا میں لکھنؤ چلا آیا تھا دوسرے دن ایک آدمی کی معرفت پاسپورٹ لکھنؤ بھیجا گیا جہاں وہ ۲۳ م کی صبح کو پہنچا اور میں اسی روز کے میل سے ۲ بجے پشاور روانہ ہو گیا پشاور میں برادران عزیز حکیم عبدالعزیز ندوی اور حکیم عبدالجلیل ندوی اور

افغان مامور و نیزہ (افغان پاسپورٹ آفیسر) عبدالغفور خاں صاحب کو
تار پہلے ہی دے دیا تھا، ۲۴ رات کو ۸ بجے کے قریب گاڑی پشاور سے
ایک اسٹیشن پہلے نوشہرہ پہنچی یہاں غیر متوقع طور پر حکیم عبدالغزیز صاحب
ندوی حکیم عبدالخلیل صاحب ندوی عبدالرحمن صاحب ندوی تاجر پشاور
پہلے سے آکر موجود تھے، ان کی ملاقات سے سجد خوشی ہوئی، ایک گھنٹہ کے بعد
گاڑی پشاور پہنچی، گو کہ میری آمد کی اطلاع عام طور سے شائع نہیں ہوئی تھی
تاہم اسٹیشن پر نمائندگان حکومت افغان، متعدد احباب جمعیتہ العلماء سرحد
اور بھارت سمجھا کے چند ارکان موجود تھے۔

شب بھر حکیم عبدالغزیز صاحب کے نو تعمیر کا شانہ ”امان منزل“
میں بسر کی صبح کو شہر کے بعض علماء اور بعض قومی کارکنوں نے ملاقات
کی عزت بخشی، پنجاب کی طرح صوبہ سرحد میں بھی شریعت کے مقابلہ میں
رسم و رواج کو قانون کی حیثیت حاصل ہے، جب سے صوبہ سرحد میں کونسل
کا قیام ہوا ہے بعض پر جوش مسلمان کارکن اس کے لئے کوشاں ہیں، کہ رسم و
رواج کو توڑ کر شرعی احکام کی پابندی کا قانون منظور کیا جائے، ان صاحبوں کے
مجھ سے خواہش کی کہ افغانستان سے پشاور کو جب واپسی ہو تو اس اثنا میں
یہاں مجلس شریعت کا اجلاس ہو اور میں اس میں شرکت کروں، چونکہ یہ خیال تھا
کہ واپسی کا راستہ بدے گا، اس لئے میں نے قبول کر لیا۔

یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ پاسپورٹ ملنے کے بعد بھی ابھی سفر کی سرکاری
وقتیں ختم نہیں ہوئی ہیں ابھی افغان گورنمنٹ کے پاسپورٹ افسر کا ویزہ اور

صوبہ سرحد کے چیف سکریٹری کے دستخط باقی ہیں، جن سے سرحد کے عبور کرنیکی اجازت حاصل ہوگی، یہ کام بھی ختم ہوا، ۲۵ کی دوپہر کو برادر م حکیم عبدالجلیل صاحب مذوی کے یہاں دوپہر کا کھانا تھا جس میں شہر کے بعض علماء اور معززین شریک تھے، کھانے کے بعد ظہر کی نماز ادا کی یہیں افغانستان مے جانے والا موٹر آگیا، یہاں سے حکیم عبدالعزیز صاحب کے افغانی دواخانہ گیا اور وہاں سے دوستوں سے رخصت ہو کر پشاور سے نکلا، غالباً ۳ بجے سہ پہر کا وقت تھا جب موٹر پشاور کے حدود سے باہر روانہ ہوا میں نے سمجھا کہ اب عوانی مسافر کا خاتمہ ہوا، مگر تھوڑی ہی دیر کے بعد درہ خیبر کے وہانہ پر جمرو کی منزل آگئی، موٹر ایک دفتر کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا، یہاں برطانوی محکمہ آمد و رفت نے ہر شخص سے ایک ایک روپیہ اور موٹر سے چاکر روپیہ وصول کئے اور رسید دے دی موٹر میں تنہا تھا ساتھ ایک میرا ملازم اور دو سرشارو فر تھا۔

اب ہم درہ خیبر کے اندر داخل ہو گئے، دونوں طرف پہاڑیوں کا طویل سلسلہ اوریچ میں درہ کا پیرپچ راستہ تھا، حکومت انگریزی نے اپنے حدود تک شریک نہایت عمدہ بنوائی ہے، درہ کا سب سے تنگ مقام مجھے وہ نظر آیا جہاں علی مسجد نام چھوٹی سی لیکن نہایت تاریخی مسجد بنی ہے، مسجد کے پاس چائے سبزی اور پھلوں کی چند دکانیں ہیں، اس مسجد تک سڑک میں دو دفعہ پہلے بھی آچکا تھا، اور یہاں ایک نماز ادا کرنے کا شرف بھی حاصل ہو چکا تھا، اس وقت پھر اس مسجد پر حسرت کی ایک نگاہ ڈالی، پہلے افغانستان اور ہندوستان کے درمیان یہی مسجد حد فاصل تھی، لیکن اب انگریزوں نے اس سے بھی آگے بڑھ کر

اپنی سرحد قائم کی ہے۔

اس درہ کے اوپر اسی کے ساتھ ساتھ خیبر ریلوے کی لائن کبھی ہے جس کی تعمیر انگریزی انجینئرنگ کی حیرت انگیز کرامت ہے، اور اس سے بھی بڑھ کر انگریزی سیاست کی سب سے بڑی کامیابی ہے، یہ ریلوے تقریباً ۵۰ میل تک اس طرح پھیلی ہے کہ کبھی پہاڑ کی چوٹی پر، اور کبھی وادی کے دامن میں، اور کبھی کسی پہاڑی کے سینے کو بیچ سے چیرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہ بہر حال ان اہمیت ناک مناظر سے گزرتے ہوئے ہم بجے کے قریب لنڈی کی وسیع وادی میں قلعہ کے سامنے جا کر موٹر پھر کا، میدان میں سپاہی ورزشی کھیلوں میں مصروف تھے، یہاں شو فر اور میرا ملازم قلعہ کے اندر گئے اور جبرود کی رسید اور پاسپورٹ جا کر دکھا آئے، جس کے بعد آگے بڑھنے کی اجازت ملی، اور موٹر نے پھر آگے کا رخ کیا کچھ دیر کے بعد انگریزی سرٹک کی صنعت کاری ختم ہوئی، اور درہ کا فطری راستہ نمودار ہوا، اور یہیں انگریزی سرحد کا آخری دفتر قائم تھا، ایک پہاڑی کے اوپر بنگلہ میں درہ خیبر انجینیئر کا دفتر تھا شو فر اور ملازم نے جا کر یہاں پھر پاسپورٹ دکھائے اور برطانیہ پاسپورٹ آفیسر نے EXAMINED کی مہر ثبت کی۔

یہاں سے نکل کر چند قدم آگے بڑھے تھے کہ افغانستان و ہندوستان کی موجودہ سرحد کا بورڈ نظر آیا جس پر انگریزی میں یہ لکھا تھا کہ ”یہاں سے ہندوستان کی سرحد ہے، اور کسی کو بغیر صحیح پاسپورٹ کے آگے بڑھنے کی اجازت نہیں“ یہاں ریلوے لائنوں کے بیچ سے جانے والے راستے پر جس طرح ریل آتے وقت

پھاٹک یا کھی اور چیر سے راستہ بند کر دیا جاتا ہے، اسی طرح ایک لمبے ستون کو آڑا کر کے راستہ روک دیا گیا تھا، یہاں دونوں طرف کے سنتری کھڑے رہتے ہیں اور اُدھر کے جانے والے اُدھر کے اور اُدھر سے آنے والے اُدھر کے سرحد دار کے سپاہیوں کی اجازت سے اس روک کو اٹھا دیتے ہیں اور مسافر پار ہو جاتے ہیں، چنانچہ حسب دستور سنتری نے برطانی سرحد داری کے سپاہی سے جو پچھلے جنگلے کے پاس کھڑا تھا، ہاتھ کے اشارے دریافت کر کے روک کو دور کیا اور موٹر دفعۂ غلام ملک سے بچل کر آزاد ملک میں داخل ہو گیا۔

یہی مقام تورخم کہلاتا ہے اور جواب افغانی دہندی سرحد ہے مجھے ایسا معلوم ہوا کہ درہ کا جتنا حصہ زیادہ پُریچ اور مشکل ہے، جنگی اور سیاسی مصلحتوں کی بنا پر برطانی حکومت نے اپنے قبضہ کو وہاں تک بڑھا دیا ہے، اب اس کے بعد درہ نسبت پھیلنا شروع ہوتا ہے، راستہ بالکل فطری حالت میں ہے، البتہ کہیں کہیں پتھروں کو بیچ سے ہٹا دیا گیا ہے اور نشیب و فراز کو برابر کر دیا گیا ہے، اس سرحد سے چند قدم کے فاصلہ پر ایک پہاڑی کے اوپر افغان حکومت کی پہلی چوکی تورخم نامی واقع ہے، اس کے نیچے پانی کا چشمہ بہتا ہے، اور ایک مختصر سے باغ یا چند درختوں کے جھنڈ کے سایہ میں خالی زمین مسجد کا کام دیتی ہے، یہاں وضو کر کے عصر کی نماز ادا کی، اور افغان افسر پاسپورٹ دیکھ کر راہ داری کا محصول چار روپے وصول کیا۔

اب ہم افغان علاقہ میں چل رہے تھے، درہ کا راستہ کشادہ ہو جا رہا تھا

پاس کی پہاڑیاں دور ہٹتی جا رہی تھیں ۱۵ بجے کے قریب افغانی مشرقی سرحد داری کے پاس پہنچ گئے جس کا نام ڈکٹہ ہے، یہاں واوی وسیع ہے، اور سامنے دریائے کابل کی نہایت کم چوڑی آبِ رواں کی چادر پھیلی ہوئی نظر آئی ایک طرف افغانی سرحد دار کا مغربی طرز کا بنگلہ تھا دوسری طرف کچی دیواروں کی عمارت کا ایک چٹا کتھا جو افغانی سرحد داری کا دفتر تھا یہاں شو فر اور ملازم نے لے جا کر پاسپورٹ دکھائے اور وہاں اس پر سرحد داری در مشرقی ملاحظہ شد برائے رفتن کابل کی اجازت مہر لکائی گئی اور خبر دی گئی کہ یہاں شاہی ہمان کی حیثیت سے افغانی سرحد دار صاحب سے میری معافی کرائی جائے گی مگر وہ بیمار تھے اندر سے باہر کے آنے کے انتظام میں تاخیر کا اندیشہ تھا اس لئے معافی مانگ کر آگے بڑھنے کی اجازت چاہی افغان سپاہی نے روک کی زنجیر ہٹائی اور موٹر آگے روانہ ہوا۔

اب قریب شام کا وقت آگیا تھا، پٹھان مسافر مرد و عورت بچے اور بوڑھے آ جا رہے تھے، اونٹ، گدھے، گائے، بیل، بھیڑیں، چراگا ہوں سے واپس آ رہی تھیں، درہ خیبر کے شروع سے لے کر یہاں تک دیہاتی پٹھان خواتین سر سے پاؤں تک سیاہ کپڑوں میں مستور کھلے منہ بڑی آزادی سے آ جا رہی تھیں، بدن پر گھٹنوں تک سیاہ کرتے، پاؤں میں بڑے گھیر کی عموماً سیاہ شلواریں، سر سے پاؤں تک سیاہ چادریں، ہر قسم کے زیور اور ظاہری آرایش سے تامترا پاک ان کو دیکھ کر خیال ہوتا تھا کہ شاید اصل سادہ اسلامی پردہ یہی ہوگا۔

ڈکٹہ سے آگے نکلے تو پہلی افغانی چھاؤنی نظر آئی، خیمے کھڑے تھے،

سپاہی اپنی خاکی وردیوں میں چل پھر رہے تھے، ان خیموں سے ذرا ہٹ کر ان کے باورچی خانہ کا خیمہ نظر آیا، ان سپاہیوں کی وردی یہ تھی، خاکی پتلون خاکی کوٹ، سر پر خاکی ٹوپی، جس کے آگے ہیٹ کی طرح چھتھا بٹھا ہوا، مصری سپاہیوں کی بھی اسی قسم کی وردی ہے، مگر ان کے سر پر ٹکی ٹوپی رہتی ہے جس کے اوپر ایک خاکی غلاف چڑھا ہوتا ہے اور اسی کپڑے کا آگے ہیٹ کی طرح چھتھا بٹھا ہوتا ہے، جس سے مقصد آنکھوں کے سامنے دھوپ کی تازت کو روکنا ہوتا ہے۔

اب شام ہو چکی تھی، اور موٹر سائے کے عالم میں پوری تیزی سے دوڑ رہا تھا، کبھی کبھی پنھان کا شتکاروں کا غول یا خانہ بدوش مسافروں کا کوئی مختصر قافلہ مل جاتا تھا، جس کے ساتھ مویشیوں کا گلا، بار برداری کے جانور یہاں تک کہ کسی بیل یا گدھے کی پیٹھ پر مرغیاں بھی بیٹھی نظر آتی تھیں، وادیوں میں کہیں کہیں کھیت بھی تھے، یکے بعد دیگرے افغانی چوکیاں بھی گزریں جن کے مکانات خام دیواروں کے تھے،

دورہ خیبر سے لے کر ادھر خام مکانات کا رواج عام طور سے ہے، اور غالباً اس سرزمین کی آب و ہوا کا اثر ہے کہ اس قسم کے مکانات بارش میں محفوظ رہتے ہیں، ادھر بارش تو کم ہوتی ہے، یہاں کی سیرابی اور سرسبزی زیادہ تر برف کے پگھلنے سے جو چشمے جاری ہوتے ہیں انہی سے ہے، واپسی میں ملتان میں بھی اسی قسم کے مکانات دیکھے، کابل و غزنین وغیرہ میں بھی ایسے مکانات نظر آئے، بلکہ تعجب ہوتا تھا کہ قلعے اور دھس اور شاہی عمارتیں

بھی اسی خام مٹی کی ہوتی ہیں یہ مٹی نہایت چکنی اور لسدار ہے کھنگل کے بعد یہ دیواریں بڑی مستحکم ہو جاتی ہیں، قلعوں میں کئی کئی گز کی چوڑی دیواریں ہوتی ہیں اور ان میں ہر کونے پر مٹی ہی کی برجیاں بنی ہوتی ہیں، دیواروں میں بندوقوں کے لئے بے شمار سوراخ ہوتے ہیں۔

ورہ خیبر میں اور دوسرے آزاد سرحد میں ہر خاندان یا قبیلہ کا اسی قسم کا الگ الگ قلعہ ہوتا ہے، جو ہر ایک کو دوسرے کے حلوں سے بچاتا ہے، اس چھوٹے سے قلعہ کا سردار ملک کہلاتا ہے، جمہور سے لے کر لندی کوتل تک اور اس کے بعد بھی اس قسم کے ملکوں کے قلعے بعض مسماں بعض کھڑے، بکثرت نظر آتے ہیں، اسی قسم کی افغانی چوکیاں راستوں میں ملیں جن میں سے بعض اچھی خاصی بلند تھیں، اور سپاہی سیڑھیوں سے چڑھ اور اتر رہے تھے، چونکہ رات ہو چکی تھی، اس لئے خیال تھا کہ ایسا نہ ہو کہ کسی چوکی پر ہم کو روک دیا جائے، مگر دکھ کے سرحد دار سے کہہ کر ٹیلیفون سے نہ روکنے کی ہدایت کرادی گئی تھی۔

اب رات کے ۸ بج چکے تھے، چاندنی چٹکی تھی، ہر طرف پہاڑوں کی دیواریں نظر آتی تھیں کہیں کہیں پتھروں سے چٹنے بہہ رہے تھے، انسانوں اور انسانی آبادیوں کا نشان میلوں تک نظر نہیں آتا تھا، گرم رفتار موٹر کی آواز کے سوا ہر طرف ساٹا تھا، اسی اثنا میں ایک پل آیا، جو گونیا بنا تھا مگر ابھی استعمال میں نہیں آیا تھا نیچے چشمہ بہہ رہا تھا

۱۸
ڈرائیور نے موٹر کو نیچے اتار کر چٹنے کے اندر سے گزر کر اوپر چڑھنا چاہا
انجن چٹنے کے سرد پانی سے بجھ کر خاموش ہو گیا، اب بار بار انجن کو ہینڈل
کر کے متحرک کرنے میں کچھ دیر لگی، باوجود اس خاموشی، تنہائی اور نق و
وق میدان کے فضا میں امن و امان کا اطمینان چھایا تھا، اور جس سے
یہ نتیجہ نکلا کہ لہذا ملک میں مسافروں کو ہر گونہ امن و آمان اور
اطمینان حاصل ہے، اور یہ ملک کی سب سے بڑی خوش قسمتی ہے۔

چند جھٹکوں کے بعد انجن گرم ہو کر پھر متحرک ہوا، اور اوپر
چڑھ کر اس منزل کو طے کیا، اب جلال آباد قریب تھا، سڑک سیدھی اور
صاف تھی، دورویہ درختوں کی صفیں تھیں جن کو ختم کرنے کے بعد
ہم کو جلال آباد کے چراغ نظر آنے لگے، اور بالآخر آبادی آئی، اور ہم
باغ شہید نام سرکاری مہمان خانہ میں جا کر اترے، سیڑھی پر مامور صاحب
استقبال کے لئے کھڑے تھے، باغ کے اندر یہ ایک بڑی عمارت تھی جس میں
متعدد کمرے آرامتہ اور مہمانوں کے لئے تیار تھے انھیں میں سے ایک
کمرہ میں اتار آگیا، مسہری اور اس پر صاف بستر اور کمرے کے قریب سے
لگے تھے، کمرہ میں میز، کرسی، آرام کرسی ہر چیز تھی۔

اس اکتوبر میں جلال آباد کا موسم پشاور کے برابر سرد تھا۔
یہاں پہنچ کر پہلے ہاتھ منہ دھو کر وضو کر کے مغرب اور عشاء کی
یکجا مسافرانہ نمازیں ادا کیں، تھوڑی دیر میں کھانا آیا، کھانے کے بعد
کابل کا مشہور سردہ اور انجود آئے، سردہ اتنا میٹھا اور ساتھ ہی اتنا

سرد تھا کہ وہ اس ٹھنڈک میں کھایا نہ گیا، رات بھر آرام کیا صبح اٹھ کر نماز کے بعد باغ کی سیر کی، کس قدر پُر لطف سماں تھا، باغ کی پشت پر پہاڑیاں تھیں، پہاڑیوں کے دامن میں دریائے کابل یا کوئی اور چشمہ آہستگی سے بہہ رہا تھا، ایک چشمہ کسی طرف سے آکر باغ کی روش کے کنارے کنارے رواں تھا، روشوں پر ہر دو طرف چنار کے لمبے لمبے درخت کھڑے تھے، یہ چہینے افغانستان میں موسم خزاں کے ہوتے ہیں، وہاں خزاں میں پتے خشک ہونے کے بجائے زرد ہو جاتے ہیں۔ ہر طرف زرد زرد پتوں کی ایک دوسری بہار نمودار تھی۔

جلال آباد کے اس باغ کا نام میں نے باغ شہید سنا، شاید اس کے امیر حبیب اللہ خاں شہید نے اس کو بنوایا ہے، باغ کی عمارت کا طرز ہندوستان سے جدا تھا، بلند کرسی تھی، جس کے بعد برآمدہ برآمدہ بیچ کے راستے سے ایک بڑے وسیع ہال میں داخل ہو جاتے تھے۔ اس پورے ہال کے اوپر چھت کے بجائے گنبد، دونوں طرف کمرے اس ہال کے پیچھے بلند سائبان جس کے نیچے ایک مختصر وادی جس میں پانی کی زانی اور سامنے مذکورہ بالا پہاڑیاں، اس باغ کی تعمیر کی نسبت گو امیر حبیب اللہ خاں کی طرف سنی، مگر بڑے ہال کے بلند دروازے کے اوپر ایک چتر نصب تھا جس پر کتبہ لگا تھا، میں نے اس کتبہ کو پڑھنے کی کوشش کی مگر افضل خاں کے نام کے سوا کچھ اور پڑھانہ گیا۔

میں نے سنا تھا کہ سچہ سقہ کے ہنگامہ میں جلال آباد اور اس کی

سرکاری عمارتوں کو بہت نقصان پہنچا تھا، اس کی ایک شہادت میں نے یہ پائی کہ باغ مذکور کے برآمدہ میں جو دروازے اور کھڑکیاں لگی تھیں ان کے ٹیشے نہ صرف ٹوٹے تھے بلکہ ان کی لکڑیوں کو آگ سے جلائے جانے کی کوشش کی علامتیں موجود تھیں۔

افغانستان کی آبادیوں کے مکانات کی چھتیں خام اور منڈیر کے بغیر اور سپیدی یا گچ کے بجائے مٹی سے باہر سے پے ہوئے ہونے کی وجہ سے ہندوستان کی عمارتوں کے دیکھنے کی علامتیں ہوں گے وہ پُر رونق نہیں معلوم ہوتی ہیں مسجدیں بھی عموماً خام دیواروں کی اور گنبد و منار سے خالی ہوتی ہیں اس لئے وہ دور سے ممتاز نظر نہیں آتیں اور اسی لئے باہر کے سیاحوں کو یہ آبادیاں آباد اور دلکش نہیں معلوم ہوتیں، حالانکہ وہ مکانات اندر سے بہت عمدہ آراستہ اور خوبصورت ہوتے ہیں موجودہ شہر جلال آباد کی بھی یہی کیفیت تھی مسافروں کے لئے ہوٹل یا کھانے کی دکانیں ہیں، چائے، دکنے روسی سماور ہر جگہ گرم نظر آتے ہیں، یہیں سے چند میل کے فاصلہ پر ہڈا ایک گاؤں ہے جہاں کے مشہور مجاہد عالم ملا، ہڈا کے نام سے ہندوستان کے انگریزی اور ہندوستانی اخباروں میں آج سے بیس برس پہلے بہت نامور تھے اور جو انگریزی فوجوں سے بار بار نبرد آزما ہو چکے تھے ان کا سرکاری خطاب نجم المشائخ تھا جس کی نسبت سے ان کے مدرسہ کا نام جو اُسی ہڈا میں واقع ہے نجم المدارس ہے اور میں نے کابل کے ایک صاحب علم سے سنا کہ وہاں ملا صاحب کا مرقہ

بہت اچھا خاصہ کتب خانہ ہے، یہ مدرسہ پرانے طرز کا عربی مدرسہ ہے
 مامور صاحب جلال آباد نے مجھے یہ بھی بتایا کہ جلال آباد کے
 اس پاس بودھ لوگوں کی بکثرت سنگی یادگاریں ہیں

جلال آباد پشاور سے اتنی میل ہے، اور کابل پشاور سے دو سو
 میل پر واقع ہے، آج ایک سو بیس میل طے کرنے تھے، صبح کو آٹھ بجے
 جلال آباد سے آگے بڑھے، مٹرک اچھی اور کچھ دور تک نئی بنی تھی، پل
 بھی مرمت ہو رہا تھا، کہیں کہیں مٹرکوں کی درستی بھی ہو رہی تھی پٹھان
 مزدور کام پر لگے ہوئے تھے، اونٹوں اور گدسوں پر لدے ہوئے خانہ بدو
 قبیلے اور کہیں کہیں بل چلانے والے کاشتکار اپنے بیلوں کے ساتھ نظر آتے
 تھے، جیسے جیسے آگے بڑھ رہے تھے، راستہ زیادہ سنگلاخ ہوتا جا رہا تھا۔

جلال آباد سے تھوڑی دور چل کر سب سے پہلی بڑی آبادی تلمانی
 آئی، یہاں ایک وسیع شاہی باغ ہے جس میں سرکاری جہان خانہ بھی ہے
 باغ میں ہر طرف درختوں کی رونق تھی، روشوں پر چنار اور آملہ کے درخت
 لگے تھے، گو راستہ دوسری طرف سے تھا لیکن ہم نے باغ کے دیکھنے کی خاطر
 باغ کے اندر سے ہو کر راستہ اختیار کیا، اس کو ایک نظر دیکھتے ہوئے آگے
 نکل گئے، قصبہ میں کاشتکاروں کی آبادیاں تھیں اور دوسرے باغ ادھر
 ادھر لگے تھے۔

افغانستان میں پہلے جب موٹروں اور لاریوں کی سواریاں رائج
 نہ تھیں اور عموماً لوگ گھوڑوں یا اونٹوں پر سفر کرتے تھے تو عموماً ہر بارہ تیرہ

میل پر پڑاؤ ہوتا تھا، اور ہر پڑاؤ پر سرکاری عہدہ داروں اور جہانوں کے قیام کے لئے مکانات بنے تھے جن میں تمام سروسا مان ہمیارہتے تھے اب موٹروں کی گرم رفتاری نے منزلوں کو دور ترکر دیا ہے۔ اب انہی میل سومیل، سواسومیل پر یہ مکانات بالکل جدید فرنیچر اور سازو سامان کے ساتھ موجود ہیں تاہم مسافر ابھی تک انہیں پرانی منزلوں کا حساب لگاتے ہیں، اور ان کی فارسی میں ہمارا ہندوستانی لفظ ”پڑاؤ“ پوری آزادی سے مستعمل ہے، اور فاصلہ بتاتے وقت مسافت کی تعیین ”یک پڑاؤ“ ”دو پڑاؤ“ سے کی جاتی ہے، میل کے بجائے ان کے ہاں ”کروہ“ کا پرانا ہندوستانی فارسی لفظ جاری ہے، جس کو ہم ہندی ”کوس“ کا مرادف کہہ سکتے ہیں، اور جو تقریباً پونے تین انگریزی میل کے برابر ہوتا ہے۔ اب جدید سرکوں کی تعمیر میں فرنیچر اصطلاحات میٹر سنٹی میٹر اور کیکلو میٹر کا رواج ہو رہا ہے۔

یہاں سرکوں پر میلوں کے نشانات نہیں لگے ہوئے ہیں اس سے مسافروں کو مسافتوں کے جاننے میں دقتیں پیش آتی ہیں، اگر ملک کی وزارت امور نافذہ اس کی طرف توجہ کرے، تو یہ ذرا سی اصلاح مسافروں کی بڑی الجھن کو دور کر دے۔

نلا سے آگے بڑھ کر شاید ایک آدھ گھنٹہ میں ہم فتح آباد پہنچ گئے یہ جلال آباد سے اٹھارہ میل پر ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ پشاور اور کابل کے ٹیک بیچ میں واقع ہے، یہ بھی ایک قصبہ سا ہے، مختصر سا بازار ہے

جس میں مسافروں کے کھانے پینے کی چیزیں اور سبزیاں ملتی ہیں چلے
 خٹے مع گرم سموروں کے کئی موجود ہیں۔

اب جب کہ کابل اور پشاور کے درمیان مسافروں کی اور اسباب
 کی لاریاں اور ٹیکسی گاڑیاں بکثرت آتی جاتی ہیں، اس بات کی ضرورت ہے
 کہ ہر تھوڑے فاصلہ پر ان کے لئے تیل اور ان کی درستی کے مختصر سامان
 موجود رہیں چنانچہ صوبہ سرحد کے ایک مسلمان تاجر نے افغانی سرکارت
 اس کا ٹھیکہ لیا ہے، ان کی پہلی دکان تو ڈوگرہ میں ملی تھی، جہاں پانی پت
 کے ایک مسلمان نوجوان نوکر تھے، دوسری دکان فتح آباد میں ملی، دکان
 کی عمارت تھی بنی تھی، عمارت کے نیچے زمین دوز کمرہ تیلوں کا گودام تھا۔
 نلکا کے آس پاس کھیت ہیں، جن میں افغانی کاشتکار اس وقت
 ہل چلا رہے تھے، یہ ہل ہندوستانی ہلوں کے مشابہ تھے، اس ملک میں
 کھیتوں کی سیرابی چشموں اور نہروں کے پانی سے ہوتی ہے، یہ چشے اور
 نہریں فطرۃ نشیب میں، جدھر جدھر گھومتی ہیں زمین کو شاداب اور
 سرسبز بناتی جاتی ہیں، اور وہاں آبادیاں قائم ہو جاتی ہیں، کچھ دنوں کے
 بعد جب ان کا رخ کسی اور طرف ہو جاتا ہے تو یہ آبادیاں بھی اُدھر منتقل
 ہو جاتی ہیں، اس انتقال مکانی کی ٹوٹی پھوٹی یادگاریں جا بجا ملتی جاتی ہیں
 سیرابی کا طریقہ یہ دیکھا کہ کاشتکار کفگیر کی طرح کی لکڑی کا کوئی
 آلہ (ڈوآ) ہاتھ میں لے کر نہروں سے پانی اُچ اُچ کر کھیتوں میں چھڑا کر بھینکتے
 ہیں، افغانستان کے بڑے بڑے شہروں میں سڑکوں پر پانی چھڑکنے کا

طریقہ بھی یہی دیکھا، سڑکوں کے دونوں طرف چٹھے بہہ رہے ہیں مینوسٹی کے ملازم جو سڑکوں کی صفائی کے لئے مامور ہیں، وہ اسی طرح سے چٹھوں سے پانی اُلچ اُلچ کر سڑکوں کو تر کرتے ہیں، تاکہ گرد و غبار بیٹھ جائے۔

جلال آباد سے فتح آباد تک سڑک کی سنگلاخی ایسی ہے کہ موٹروں کو سخت سے سخت ہچکولے پڑتے ہیں، ہمارا موٹر گویا وہ مستعمل نہ تھا، مگر اس کے ایک پہیے کے نیچے کی کمافی ٹوٹ گئی، فتح آباد کی تیل والی دکان میں پہنچ کر موٹر میں جب تیل ڈالا جانے لگا تو اس ٹوٹی کمافی پر نظر پڑی بڑی مشکلوں سے وہاں لوہے کی ایک لمبی سلخ کا ٹکڑا ملا جس کو ٹیڑھا کر کے لوہے کے تار سے باندھ کر اس کمافی کی مرمت کی گئی جس میں تقریباً ڈیڑھ گھنٹے لگ گئے، اس دکان کے ملازم بھی ہندوستانی تھے انھوں نے جائے سے تواضع فرمائی، انھیں نے مجھے بتایا کہ یہاں سے چھ میل پر ایک مزار ہے جس کی نسبت یقین کیا جاتا ہے کہ وہ حضرت لوط کی قبر ہے اور لوگ اس کی زیارت کو جاتے ہیں۔

یہاں کچھ بچے قرآن پاک اور پرانی گلستاں دبوستاں اور کسی فارسی نظم کے سہق پڑھتے نظر آئے، ان کے گاکر پڑھنے کی خاص لے تھی جو مجھے تو بہت خوش آئند معلوم ہوئی۔

گیارہ بجے کے قریب موٹر کی مرمت ختم ہوئی، اور ہم آگے بڑھے راستہ اُسی طرح دشوار گزار سنگلاخ اور پُریچ تھا، ہم کو کابل پہنچ کر ذرا لے حکومت سے معلوم ہوا کہ موجودہ حکومت نے کابل اور پشاور کے درمیان

ایک اور سڑک کا کام شروع کیا ہے، جو نسبتً اس سے کم دشوار گزار ہے اور ساتھ ہی اس راستے سے کابل اور پشاور کے درمیان پچاس میل کی مسافت کم ہو جائے گی اور امید ہے کہ اس سڑک کی تیاری کے بعد ہندوستان و افغانستان کی آمد و رفت اور تجارتی کاروبار میں بہت بڑی ترقی ہو جائے گی میرے خیال میں پشاور سے جلال آباد کو وہی نسبت ہے جو چین اور کوئٹہ سے قندھار کو ہے مگر قندھار کے بازاروں میں جو رونق اور آبادی اور دکانوں کی کثرت نظر آتی ہے، وہ جلال آباد کو نصیب نہیں حالانکہ جلال آباد پشاور سے صرف اسی میں ہے، اور اسی بنا پر جلال آباد میں تجارتی ترقی کی بہت بڑی صلاحیت موجود ہے کہ افغانستان و پاکستان اور دیگر مشرقی کوشستانی کے درمیان یہی ایک شہر تجارت کا مرکز بن سکتا ہے۔

فتح آباد سے چل کر ڈیڑھ بجے دن کو ہم کو لال نامی قصبہ میں پہنچے آبادی گو مختصر مگر مشغول معلوم ہوئی جھوٹا سا بازار بھی ہے جس میں دن رات کی ضرورت کی چیزیں ملتی ہیں، کھانے کی کئی دکانیں تھیں یہاں سے کابل پھر کوئی ایسا مقام نہ تھا۔ اس لئے یہاں کھانے کا انتظام کیا گیا اس دکان کو ہوٹل تو نہیں کہہ سکتے، گو یہاں اس کا یہی نام ہے ہاں باورچی کی ایک سٹری دکان کہہ سکتے ہیں، ایک طرف میرے لئے اس نے میز اور کرسی لگا دی اور اوپر کھانا رکھ دیا، پشاور سے جو افغانی روٹی شروع ہوتی ہے وہی پورے افغانستان میں ملتی ہے، چپاتیوں کا رواج نہیں، دنیا کے

اکثر ملکوں کی طرح یہاں بھی گھروں میں روٹیاں بازاروں سے پاک کر آتی ہیں یہ بڑی قسم کی تنوری روٹی ہوتی ہے، روٹی، مرغ، انڈے اور فیرونی کے تین کھانے اور کافی کی تین پیالیاں میرے اور شوفر اور ملازم کے لئے تھیں مگر اس ارزانی کو سن کر آپ حیرت زدہ ہوں گے کہ اُن کی مجموعی قیمت انگریزی سکہ کے حساب سے صرف ایک روپیہ ایک آنہ تھی۔

ملک افغانستان کے اندر اب تک شاید سوا سو میل کے قریب ہم طے کر چکے تھے مگر اب تک کسی مسجد کے منار سے نگاہیں نہیں مکرانی تھیں یہاں آ کر ایک بیک خیال ہوا کہ کیا یہ پورا اسلامی ملک مسجدوں سے خالی ہے؟ میں نے دکاندار سے دریافت کیا کہ یہاں کوئی مسجد ہے، اس نے سامنے کے بلند چبوترے کی طرف اشارہ کیا، ظہر کا وقت تھا وہاں گیا تو دیکھا کہ قصبہ کی سب سے اونچی جگہ پر مٹی کا ایک چبوترہ ہے، اسی کے ساتھ ایک چھوٹا سا دالان ہے۔ دالان میں صرف ایک دروازہ تھا اس کو کھول کر دیکھا تو دیواریں، امام کی جگہ کے لئے محراب بنائی گئی تھی اور خطیب کے لئے بغل میں ایک دوزینہ کا چبوترہ تھا، اب سمجھ میں آیا کہ چونکہ یہاں کی ان مسجدوں میں گنبد اور منارے نہیں ہوتے، اسی لئے وہ اجلیوں کو مسجدیں نہیں معلوم ہوتیں۔

بہر حال مسجد میں ظہر اور عصر کی یکجا نماز ادا کر کے ۳ بجے کے قریب آگے چلے، اب ہم جیسے جیسے آگے بڑھتے جاتے تھے، راستہ کا بیچ و خم اور نشیب و فراز بڑھتا جاتا تھا، راستہ کیا پہاڑوں کے بیچ سے اور کبھی ان کے

ادھر سے اور کبھی اُدھر سے، پہاڑوں کو بجا بجا کر وہ نکالا گیا ہے اور جو اس قدر کم چڑا ہے کہ دو موٹریں مشکل چل سکیں، ان کے نیچے ہر قدم پر عیسٰی غار، کھڈ، یا چشمہ، اگر ڈرائیور ایک سکنڈ کے لئے بھی غفلت کرے تو موٹر اور سواریوں کی ہڈیوں تک کا بھی کہیں پتہ نہ چلے، پہاڑی راستوں کا پیچ و خم اس قدر ہے کہ ہر موٹر پر یہ ڈر لگتا تھا کہ کوئی لاری یا موٹر اُدھر سے آئے تو ٹکرا نہ جائے اور واقعہ یہ ہے کہ اگر واقعہ کار اور مشاق ڈرائیور نہ ہوں تو بسلاست پہنچنا مشکل ہے، اس پست و بلند اور ناہموار راستہ کو دیکھ کر سعدی کی درویشانہ کیفیت کا شعر یاد آتا تھا۔

گھے بر طارم اعلیٰ نشینم
گھے بر پشتِ پائے خود نہ بینم

الغرض ان خطرناک نشیب و فراز اور زیر و بالا اور چڑھاؤ آتا راستوں کو طے کر کے مغرب کے بعد ہم اس مقام پر پہنچے جہاں دریائے کابل میں بند باندھا گیا ہے اور پانی بلندی سے نیچے گرتا ہے، اس کے پاس ہی قرینہ کی ایک آبادی آئی، جس کا نام شاید خاک جبار ہے اور اس کے بعد دو تک راستہ اس طرح ہے کہ اوپر پہاڑی دیوار نیچے سڑک اور اس کے نیچے پتھروں سے اکھٹا اور نشیب و فراز سے ہاتھ پائی کرتا ہوا چشمہ منادریا کا پانی بہہ رہا ہے، اس وقت بھی کابل سے سرشام چلنے والی لاریاں سامان و اسباب اور مسافروں سے بھری ہوئی راستہ میں ہلتی جاتی تھیں، اخیر مغرب کو شاید کابل سے ۵ میل پہلے، بتِ خاک پہنچے، یہ گویا

کابل کا پھاٹک ہے، پرانی وضع کا اچھا خاصہ بازار ہے آمد و رفت کی کثرت بھی تھی یہاں سرِ راہ ایک مکان کے سامنے موٹر کا معلوم ہوا کہ یہاں کابل جانے کا محضول چنگی وصول ہوتا ہے، یہاں سے کابل کا سیدھا راستہ ہے سڑک چوڑی ہموار اور صاف سڑک کے دونوں طرف چٹے بہہ رہے تھے اور ان کے نیچے غالباً چنار کے درخت دو روہ لگے تھے جیسے جیسے شہر قریب آتا جاتا تھا روشنی کی رونق بڑھتی جاتی تھی، اب شہر کابل کا چنگی خانہ آیا یہاں موٹر کا نمبر ڈرائیور کا نام مسافر کا نام وغیرہ درج کیا یہیں ٹیلیفون آیا کہ حکومت کی طرف سے چند نمائندے استقبال کے لئے آرہے ہیں، چند منٹ انتظار کیا جائے، انتظار کو کچھ ہی منٹ گزرے تھے کہ پیچھے سے ایک تیز رفتار شاہی موٹر آکر رکا، اور اسے چند اصحاب اترے جن میں سے ایک وزارت خارجہ کے اور دوسرے صاحب وزارت تعلیم کے نمائندے اور ایک دو اور بزرگوار تھے، انھوں نے خوش اخلاقی سے مصافحہ کیا اور اپنی اپنی وزارتوں کی طرف سے خوش آمدید اور مہمان نوازی کے الفاظ ادا فرمائے، اور مجھے اپنی کار پر لے کر شہر میں داخل ہوئے۔

رات کا وقت تھا شہر کے اکثر حصے بجلی کی روشنی سے منور تھے بعض حصوں کی عمارتیں اچھی خاصی بلند اور شاندار اور سڑک صاف و ہموار تھی، پولیس کے سپاہی اچھی خوش نما و دیوں میں آمد و رفت کے نظم و نسق کے لئے کھڑے تھے، پرانے کابل سے گزر کر ہم کابل کے نئے

شہر میں پہنچے، اور دارالامان میں لائے گئے جس کو امیرامان الشہ خاں نے اپنے زمانہ میں جدید طریق پر آباد کرنا چاہا تھا، یہاں یورپین انجنیروں کی نگرانی میں جدید طرز و انداز کی پانچ چھ سرکاری عمارتیں بنی ہوئی ہیں، اور ہر عمارت کئی کئی منزل کی ہے، انھیں عمارتوں سے ایک شاندار عمارت شاہی مہمان خانہ ہے، اسی مہمان خانہ کے سامنے آکر موٹر گا اور ہم سب اتر کر باغ کے اندر داخل ہوئے، اس باغ کے پھاٹک پر وہ صاحب ملے جو ہم نووارد مہمانوں کی خاطر مدارات اور دیکھ بھال کے لئے مقرر تھے، ان کا نام سرور خاں اور گویا تخلص ہے، یہ امیر عبدالرحمن مرحوم کے زمانے کے مشہور سردار عبدالقدوس خاں کے پوتے ہیں کچیس تیس کے درمیان عمر ہوگی یہ فارسی کے علاوہ عربی اور انگریزی بھی جانتے ہیں، شعرو شاعری کا بہت اعلیٰ مذاق رکھتے ہیں، فارسی میں کم کوئی اچھا شعر ہوگا جو ان کو یاد نہ ہو، شعرا، بچم اور میرزا منظر کے خریطہ جواہر کے تمام منتخب اشعار ان کی نوک زبان ہیں، اندازہ ہے کہ کچیس تیس ہزار شعر ان کو یاد ہوں گے، اخلاق پسندیدہ، اطوار شایستہ، ذہن سا مذاق عالی، تذکروں کے حافظ، اور قلمی کتابوں کے جویا، فارسی تحریر کا سلیقہ بہت خاصہ رکھتے ہیں، کابل کی شاہی انجمن ادبی (جس کو رائل اکادمی) کہنا چاہئے اور جس کو موجودہ حکومت نے قائم کیا ہے، کے رکن رکن ہیں، رسالہ کابل میں ان کے مضامین چھپا کرتے ہیں۔

سرور خاں نے جیسے ہی اپنا نام بتایا میں نے عرض کی، کابل میں وہ

و اکنوں در کابل می بینم“ انھوں نے اس فقرہ سے مزا لیا، اور مجھے ساتھ لے کر مہمان خانہ کی دوسری منزل پر لے گئے، جہاں ہمارے پیشرو رفیقوں کا قیام تھا اور اس کا ایک کمرہ میرے لئے مخصوص تھا، یہاں سب سے پہلے مدیر صاحب مہمان خانہ سے تعارف کرایا پھر ڈاکٹر اقبال اور نواب سر اس مسعود سے جا کر ملا، سر اس مسعود کے ساتھ پروفیسر ہادی اور ڈاکٹر سر اقبال کے ساتھ غلام رسول خاں بیرسٹر لاہور، سکریٹری ہو کر آئے تھے، ان سے ملاقات ہوئی، پروفیسر ہادی میرے پرانے دوست ہیں، ان سے بارہ برس کی ملاقات ہے، نواب محسن الملک مرحوم کے بھتیجے ہیں، پہلے سائنس کے لئے انگلستان گئے تھے پھر واپس آکر جامعہ ملیہ میں رہے، وہاں سائنس کلاس کو ترقی دی پھر مسلم یونیورسٹی میں چلے گئے، فارسی ایک حیثیت سے ان کی مادری زبان ہے، اور ایرانی فارسی، ایرانی لب و لہجہ میں اچھی بولتے ہیں اور ماشاء اللہ مردانہ حسن صورت اور اعتدال قامت سے بھی سرفراز ہیں، فارسی میں اب جا کر پی ایچ ڈی کی ڈگری لندن سے حاصل کی ہے، اور ایرانی جہاز رانی پر انگریزی میں ایک کتاب بھی لکھی ہے۔

غلام رسول خاں آج سے چوبیس برس پہلے امیر حبیب اللہ خاں کے زمانہ میں کابل میں بصیفہ تعلیمات چند سال رہ چکے تھے اس لئے ان کی رفاقت سے سب کو بہت آرام پہنچا۔

بہر حال اس وقت جب ان صاحبوں سے ملاقات ہوئی تو میں نے

عرض کی کہ مجھے چھوڑ کر آپ سب کے اس بجلت سفر پر مجھے اردو کا ایک پانا
شعر راستہ بھر یاد آیا کیا۔

یارانِ تیز گام نے منزل کو جالیا

ہم محوِ نالہ جریں کارواں رہے

سب نے کہا یہ شعر گویا آج ہی کے لئے کہا گیا تھا

اس وقت نوبکے شب کو سردار ہاشم خاں صدر اعظم کے ہاں
مہانوں کی دعوت تھی ابن کاٹیلیفون آیا کہ ”نوار دہمان“ بھی شریک
دعوت ہوں اور لوگ تیار ہو چکے تھے اس لئے تاخیر کے خیال سے
میں بھی اسی حالت میں بلا تبدیل لباس ساتھ ہو گیا، ہم لوگ دو موٹروں
میں روانہ ہوئے ایک میں ڈاکٹر اقبال، میں اور سردار خاں گویا اور
دوسرے میں سر اس مسعود پروفیسر ہادی اور غلام رسول خاں، تھوڑی
دیر میں صدر اعظم صاحب کے محل تک پہنچے محل میں ہر جگہ بجلی کی روشنی
تھی جگہ جگہ فوجی سپاہیوں کے پہرے تھے ایک دروازہ پر پہنچ کر اتنے
دوسرے مہمان سب پہنچ چکے تھے سب سے آخر میں ہم لوگ پہنچے تھے محل
میں ہر چیز پور پن طریق و قاعدہ سے تھی ایک گیلری سے ہو کر اندر وسیع
والان میں پہنچے سب سے تعارف اور ملاقات ہوئی، مہمانوں میں جن صاحبوں
کے نام اس وقت یاد آتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں، سردار شاہ محمود خاں
وزیر حربیہ، شہزادہ اسد اللہ خاں کمانڈر افواج شاہی، سردار فیض محمد خاں
وزیر خارجیہ، سردار احمد خاں وزیر دربار، اسد نواز خاں وزیر فوائد عامہ

میر عطا محمد خاں صدر مجلس اعیان (پارلیمنٹ) وغیرہ

چند منٹ کے توقف کے بعد سردار ہاشم خاں صدر اعظم تشریف لائے، بالاقدر وجیبہ چہرہ، گورازنگ، متوسط بدن، فریج کٹ داڑھی، سر پر افغانی ٹوپی، جسم پر کوٹ اور پتلون، افغانستان جدید میں امیر حبیب اللہ خاں کے زمانہ سے سر کے علاوہ باقی جسم میں یورپین لباس رواج پذیر ہے یہاں کے تعلیم یافتہ اصحاب، ارباب مناصب عہدہ دار فوج، پولیس، سپاہی، حتیٰ کہ خدام اور سرکاری شوفر تک یہی لباس پہنتے ہیں۔ ہاشم خاں نے آکر مہمانوں سے مصافحہ کیا، سردار فیض محمد خاں ہندوستانی مہمانوں کا ایک ایک کر کے تعارف کرایا، اس کے بعد سردار ہاشم خاں سب کو لے کر کھانے کے کمرے میں گئے کھانا میز و کرسی پر تھا، اور ہر چیز یورپین طریق پر آراستہ تھی، کھانا کھلانے والے ملازمین بدستور سیاہ کپڑوں میں تھے، ہاتھوں میں سپید دستانے اور سر پر افغانی ٹوپیاں، کھانے کی گول میز مختلف قسم کے انگوروں اور پھلوں اور گلدانوں سے آراستہ تھی، کھانا کھانے اور کھلانے کا طریق اور ملازموں کا ادب و سیلفہ ہر چیز آج کل کی متمدن دنیا کی سطح کے برابر تھی، اور بقول ڈاکٹر اقبال ہم کو تعجب ہو رہا تھا کہ آیا ہم افغانستان کے شہر کابل میں ہیں یا متمدن جدید کی نئی دہلی میں۔

میز پر مختلف قسم کی باتیں شروع ہوئیں، سردار خاں گویا نے میری طرف اشارہ کر کے کہا کہ مولانا کہتے ہیں کہ رسالہ کابل میں افغانستان کے

اکثر علما و مصلحا و شعراء اور ارباب کمال کے حالات چھیپتے ہیں مگر اس کا ذکر اب تک نہیں آیا جس نے کابل میں سب سے پہلے اسلام کی دعوت پیش کی، سب نے پوچھا وہ کون ہے؟ میں نے کہا خراسان کے عام مقاتل بن حیان جو ابوسلم خراسانی سے بھاگ کر ادھر چلے آئے تھے اس سلسلہ سخن سے افغانستان کی تاریخ پر گفتگو شروع ہو گئی اور اس موضوع پر سردار فیض محمد خاں نے جو عہد امانی میں وزیر تعلیم اور اب وزیر خارجہ ہیں اس قدر پر معلومات گفتگو فرمائی اور ہندوستان کے موربا خاندان (پٹلی تیرا) اور پنجاب کی قدیم سلطنتوں اور افغانستان کے تعلقات کا ذکر اس خوبی سے کیا کہ میں ان کا بجد معترف ہو گیا، مگر اس سبب نے اپنے جاپانی سفروں کے حالات سے اس علمی و سترخوان میں نہی لذت پیدا کی ڈاکٹر اقبال نے فلسفہ و سیاست کے نکات بیان فرمائے۔

اسی میز پر رئیس اعیان میر عطا محمد خاں کے متعلق معلوم ہوا کہ ۱۹۲۶ء والی مکہ کی مشہور موتمر اسلامی میں وہ بھی سفیر افغانستان کے ساتھ شریک تھے، اور وہ کہتے تھے کہ میں نے تمہیں وہاں دیکھا تھا، مگر مجھے ملنا یاد نہیں آیا یہ نہایت متین و سنجیدہ اور خاموش بزرگٹ ہیں، چہرہ پر خوبصورت دائرہی ہے، سن بچپن اور ساٹھ کے قریب ہو گا۔ عربی ممالک کی سیاحت کی ہے اور عربی زبان خوبی اور روانی کے ساتھ بولتے ہیں۔ وزیر حمد بیہ شاہ محمود خاں، نادر خاں شہید مرحوم کے سب سے چھوٹے بھائی ہیں ابھی گوجران ہیں مگر ماشاء اللہ جوان صالح ہیں۔ ان میں

ہر و اعزیزی اور محبوبیت کی شان معلوم ہوتی ہے، وہ اپنی فوجی وردی میں تھے اور شہزادہ اسد اللہ خاں بھی فوجی وردی میں تھے۔ یہ شاہی فوجی دستہ کے کمانڈر ہیں، امیر حبیب اللہ خاں مرحوم کے خلیفہ الرشید امیر امان اللہ خاں کے سوتیلے بھائی، اور نادر خاں اور ہاشم خاں وغیرہ کے بھانجے ہیں ابھی گو سن کم ہے مگر سعادت کا نور پیشانی پر نمایاں ہے غالباً پچیس برس کے قریب عمر ہوگی۔

ہمارے رفقاءے طعام میں اللہ نواز خاں بھی خاص ذکر کے قابل ہیں شاید لوگوں کو یاد ہو کہ جنگ عظیم کے زمانہ میں اسلامیہ کالج لاہور کے گیارہ طالب علم سرحد پار چلے گئے تھے ان میں سے ایک یہ تھے گو یہ اصلاً افغان ہیں مگر مدت سے ان کا خاندان ملتان میں آباد ہے، اور وہ اس طرح ہندوستانی اور افغانی دونوں ہیں، سچے سچے ہنگامہ کے وقت جنرل نادر خاں کو جس نے سب سے پہلی مدد دی وہ یہی تھے، ان کا مجاہد کی حیثیت سے سرحد بعض قبائلی پرائیڈ تھا وہ انھیں میں سے تین آدمی لے کر نادر خاں کے پاس آئے اور انھیں کا سب سے پہلا دستہ تھا جو شاہ ولی خاں کے ساتھ کابل پہنچا تھا موجودہ حکومت ان کے خدمات کی پوری قدر کرتی ہے اور اس نے ذمہ داری کے مختلف عہدوں پر ان کو سرفراز کیا، اور اب وہ اعلیٰ وزیر فوائد عامہ (پبلک ورکس) ہیں، دو ہرا بدن، چوڑا چہرہ، گندم گوں رنگ، چہرے سے استقلال اور عزم برتا ہے۔

کھانے سے فارغ ہو کر ملاقات کے پہلے کمرے میں آکر بیٹھے، چائے کافی

سگریٹ وغیرہ سے تواضع ہوتی یہی سردار ہاشم خاں نے دریافت کیا کہ
 گانا سننے میں تو کوئی حرج نہیں ہے میں نے کہا بلا ساز کے کوئی مضائقہ نہیں
 شاید ساز کا لفظ نہ سمجھے فرمایا "ہمارے ہاں رنڈی منڈی نہیں ہوتی مرد گاتے
 ہیں" ڈاکٹر اقبال نے تائید کی گویوں یا قوالوں یا فوجی نغمہ نوازوں کا ایک دستہ
 آیا نشستیں کر سیوں پر تھیں وہ ادب سے آداب بجا لا کر نیچے قالین پر بیٹھ گیا
 اور نغمہ طرازی شروع کی ہندوستان میں تو بے دل عظیم آبادی کی بہت کم
 پرش ہے مگر افغانستان اور سنہائے ایشیائے وسطی کے دوسرے فارسی
 داں ملکوں میں بیدل کی بہت قدر ہے، قوالوں نے بھی بیدل کی غزل شروع
 کی پھر حافظا کی ایک دو غزلیں پڑھیں پھر بیدل کو شروع کیا، تھوڑی دیر
 تک یہ مجلس سماع گرم رہی اور بعد ازیں میزبان کا شکریہ ادا کر کے سب
 یہاں ایکے رات کے قریب رخصت ہوئے۔

دوسرے دن جمعہ کا روز تھا خیال تھا کہ آزاد اسلامی ملک کا
 بھی جمعہ دیکھیں صبح کو مختلف اصحاب ملنے کو آئے جن میں ہندوستانی بھی تھے
 اور تعلیم یافتہ افغان اور اہل منصب بھی ہندوستان اور افغانستان کے
 وقت میں قریب قریب ایک گھنٹہ کا فرق ہوتا ہے وہاں کی گھڑی ہمارے
 ہاں سے ایک گھنٹہ پیچھے رہتی ہے میں نے اپنی گھڑی نہیں بدلی تھی اور
 صاحبوں نے پیچھے کرنی تھی نماز کا وقت بارہ بجے کے بعد آگیا شامادار خان
 مرحوم مختلف مسجدوں میں نماز جمعہ ادا کرتے تھے، مگر اس دن شہر کی رے
 بڑی جامع مسجد میں جس کا نام "جامع مسجد پل خشتی" ہے نماز پڑھنے والے تھے

ہم لوگ بھی وہیں پہنچے امیر معاویہ پر جب سے دمشق کی مسجد میں ایک خارجی نے حملہ کیا تھا اُس وقت سے سلاطین اسلام میں یہ رسم چلی آتی ہے کہ مسجد کی عمارت میں ایک گھرا ہوا کمرہ بادشاہ کے لئے ہوتا ہے، امیر معاویہ نے جب یہ بدعت جاری کی تھی تو اس کا نام ”مقصورہ“ تھا معلوم نہیں افغانستان میں اس کو کیا کہتے ہیں بہر حال اس جامع مسجد میں بھی یہ مقصورہ بنا ہوا ہے اور افغانستان کے بادشاہ اسی میں نماز پڑھتے رہے ہیں۔

”پُلِ خشتی“ ایک پل کا نام ہے جو لکڑی کے بجائے اینٹوں سے بنا ہے اس لئے پُلِ خشتی کہلاتا ہے اور اسی نسبت سے مسجد کو جامع مسجد پُلِ خشتی کہتے ہیں، یہ مسجد پرانے شہر میں ایک تنگ بازار کے اندر واقع ہے مسجد وسیع تھی مگر ہندوستان کی جامع مسجدوں کی طرح شاندار نہیں نمازی دروازے سے لے کر محراب تک بھرے تھے، غریب مسلمانوں کی کمی نہ تھی، طاہری حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ ملک کی عام مالی حالت بلند نہیں، یہ سب پرانے افغانی لباسوں میں تھے، سامنے منبر پر کوئی افغانی مولوی صاحب فارسی میں وعظ فرما رہے تھے۔

ہم لوگوں کو شاہی مقصورہ میں لے جایا گیا، وہاں دوسرے مخصوص اصحاب بھی پہلے سے موجود تھے تھوڑی دیر کے بعد اعلیٰ حضرت شاہ نادر خان مرحوم تشریف لائے، چھریا بدن، بالا قامت، جسم پر سیاہی مائل مخطط سوٹ پاؤں میں بوٹ، سر پر کلاہ اور دستار، ہاتھوں میں سپید دستانے مسجد میں وہ نہایت سادگی کے ساتھ داخل ہوئے اہل مسجد سب اپنی اپنی جگہ پر بیٹھے

رہے یعنی جن سفوں سے وہ گزرے وہاں لوگ ان کی تعظیم کے لئے کھڑے نہ ہوئے اور نہ واعظ صاحب نے اپنا وعظ بند کیا، مومل مسلمانوں کی یہ ادا کس قدر موثر ہے کہ خانہ خدا میں غیر خدا کی تعظیم نہیں جب وہ مقصورہ کے دروازہ کے پاس آئے تو آنکھوں نے ایک ایسا منظر دیکھا جو اسلام کی مساوات کی عملی مثال کے طور پر دل میں محفوظ رہے گا۔

وہ مقصورہ کے دروازے کے سامنے پہنچے تو ایک بلند بالا غریب پیر کہت سال اپنی جگہ سے اٹھ کر ان تک پہنچا سر پر عربی منديل بندھی تھی پاس پہنچ کر اس نے شاہ مرحوم کے رخسار کو بوسہ دیا (افنا انسان میں محبت کے اظہار کے طور پر ایک دوسرے کے رخسار کو بوسہ دیتے ہیں) شاہ مرحوم نے بھی اسی محبت سے اس کے رخسار کو بوسہ دیا اور اس کو اپنے ساتھ مقصورہ میں لے آئے اور باڈی گارڈ کے آدمیوں سے فرمایا کہ ان کو بھی یہیں اگلی صف میں جگہ دو، اندر آ کر سب سے ملے، مجھ سے چونکہ پہلی ملاقات تھی اس لئے سردار فیض محمد خاں نے مجھے ملایا، مصافحہ کیا اور تواضع اور خاکساری کے انداز میں خیریت دریافت فرمائی، اور اپنے پہلو میں جگہ دی تھوڑی دیر کے بعد وعظ ختم ہوا، مودن نے اذان دی اذان کے بعد سب سنتیں پڑھنے کو کھڑے ہو گئے، پھر دوسری اذان ہوئی اور خطیب نے عربی زبان میں خطبہ شروع کیا، دوسرے خطبہ کے آخر میں جب خطیب نے شاہ غازی و مجاہد شاہ نادر خاں کا نام لیا تو میں نے دیکھا کہ مرحوم نے اپنے سینہ پر ہاتھ رکھ کر تواضعاً اپنے سر کو جھکایا

ان کی یہ ادا مجھے بہت پیاری معلوم ہوئی۔

خطبہ کے بعد دو گانہ جمعہ اور اس کے بعد حسب معمول سنتیں ادا ہوئیں، لوگ اپنی جگہ جگہ پر بیٹھے رہے، اس کے بعد امام نے دعا مانگی اور سب مصلیوں نے بھی آمین کے لئے ہاتھ اٹھائے، نماز سے فارغ ہو کر شاہ مرحوم نے ایک اور موثر نظارہ پیش کیا، ان مرد ضعیف کو اپنے پاس بلا کر ہم لوگوں سے فرمایا کہ ”یہ سید ہیں“ اور نیک ہیں اور میرے پرانے ملنے والے ہیں“ پھر ان سے کہا کہ آپ دعا کیجئے کہ اسلام کا بھلا ہو اور مسلمانوں کی خدمت جس سے بن آئے اس کو نیک توفیق عطا ہو۔ پہلے تو وہ سمجھے نہیں کہ شاہ مرحوم نے کیا فرمایا، شاہ نے دوبارہ وہی الفاظ فرمائے تو انھوں نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے شاہ مرحوم نے اور ان کے ساتھ ہم لوگوں نے بھی ہاتھ اٹھا کر آمین کہتی اس کے بعد سب اٹھے شاہ مرحوم نے ہم مہمانوں سے فرمایا کہ ”میں نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا ہے“ اگر آپ لوگ پسند فرمائیں تو ساتھ ہی کھانا تناول کریں۔ مگر دوسرے ضروری کاموں کے سبب ہم سب نے اس وقت معذرت چاہی اس کے بعد سب سے مل کر وہ اپنے موٹر پر واپس گئے ان کے پیچھے ان کے باڈی گارڈ کی کار روانہ ہوئی۔

ہم غلام ملک کے رہنے والوں کے لئے شاہ و گدا کی یکساں نماز کا نظارہ نہایت موثر تھا ڈاکٹر اقبال فرمانے لگے کہ آج میں سمجھا کہ دارالرحمۃ

میں جمعہ کی نماز کیوں نہیں؟ میں نے عرض کی ڈاکٹر صاحب آپ نے
اسلام کے نظریہ کے طور پر جو فرمایا تھا۔ ۵

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

آج آپ نے عملاً اس کی تصویر دکھی اگر غزنین کا بڑا موقع نہیں
دیکھا تو کابل کا چھوٹا موقع تو دیکھ لیا فرمایا ہاں دیکھ لیا۔

چینی ترکستان۔ نماز جمعہ سے واپسی میں میرے اور ڈاکٹر اقبال صاحب
کے ساتھ ایک اور ذمہ دار باخبر بھی تھے ان سے چینی ترکستان کے
واقعات کی نسبت گفتگو ہوتی رہی چینی ترکستان اور افغانستان کی
سرحدیں باہم ملتی ہیں یہ معلوم ہوا کہ جس طرح ہندوستانی سرحد کے
قبائل ہیں اسی طرح اُدھر بھی قبائل ہیں جن کے چینی ترکستان سے تعلقات
ہیں ان قبائل میں سے پانچ ہزار افغانوں کے قریب ترک مجاہدین کے
شریک حال ہیں یہ بھی معلوم ہوا کہ روسی حکومت ان مجاہدین کی حکمت
کو ذرا بھی کامیابی نصیب ہو تو اس کو تسلیم کر لینے کے لئے بالکل تیار ہے
بلکہ وہ اس کے لئے بخارا کے سابق گورنر کو بطور سفیر اعلیٰ کے منتخب کر چکی
ہے اس کی بھی تصدیق ہوئی کہ اس ترکی تحریک میں کامیابی کی طرف سے
خطرات چینی حکومت کی فوجی قوت کے سبب سے نہیں بلکہ خود مسلمانوں کی
باہم فرقہ آرائی اور نفاق انگیزی کے سبب سے ہیں چنانچہ چین کی طرف سے
لڑنے کے لئے بھی جو لوگ آئے ہیں وہ تنگیاں یعنی چینی مسلمان ہیں۔

مشرق وسطیٰ کی مرکزیت اور اسلام

ڈاکٹر صاحب نے اس موقع پر ایک عجیب بات فرمائی جو حالات کے لحاظ سے یقیناً متوقع ہے۔ فرمایا کہ یورپ نے اپنی اس نئی ترقی میں اپنا سارا زور بحری طاقت پر صرف کیا اور ہر قسم کی تجارتی آمد و رفت اور سیر و سیاحت کے راستے دریائی رکھے اور اپنے انہیں جہازوں کے ذریعہ سے مشرق کو مغرب سے ملا دیا لیکن اب یہ نظر آ رہا ہے کہ ان بحری راستوں کی حیثیت جلد فنا ہو جائے گی، اب آئندہ مشرق وسطیٰ (سنٹرل ایشیا) کا راستہ مشرق و مغرب کو ملائے گا اور تری کے بجائے خشکی کا راستہ اہمیت حاصل کرے گا۔ تجارتی قافلے اب موٹروں، لاریوں، ہوائی جہازوں اور ریلوں کے ذریعہ مشرق و مغرب میں آئیں جائیں گے۔ اور چونکہ یہ پورا راستہ اسلامی ملکوں سے ہو کر گزرے گا۔ اس لئے اس انقلاب سے ان اسلامی ملکوں میں عظیم الشان اقتصادی و سیاسی انقلاب رونما ہوگا اور اس وقت پہلے کی طرح پھر افغانستان کو دنیا کی شاہراہ بننے کا موقع ملے گا اس کے لئے ابھی سے اس کو تیاری کرنی چاہئے۔

اس نظریہ کے ثبوت میں یقیناً حالات ہمارے سامنے ہیں پشاور، کابل کو چین سے قندھار کو کابل سے مزار شریف اور ہرات کو قندھار سے ہرات کو موٹریں اور لاریاں چل رہی ہیں، ادھر راستہ یا تجارتی راہ ہو کر یا ادھر

۴۱
 ایران ہو کر طے کیجئے پہلے مشرق وسطیٰ کے لوگ خشکی کی راہ سے حج کرنے جاتے تھے، اکبر کے زمانہ سے ہندوستان کے بندر گاہوں سے جانے لگے اور انگریزوں کے عہد میں افغان نشان اور ترکستان بلکہ اکثر مشرقی ملکوں کے مسلمان ہندوستان ہو کر بحری راستہ سے مکہ معظمہ جانے لگے، اگر خشکی کا راستہ ذرا درست ہو جائے تو یقین کیجئے کہ ان حاجیوں کو پھر بدستور سابق خشکی کا راستہ پسند آنے لگے گا، اور پھر افغانستان یا بلوچستان ہو کر ایران، ایران سے عراق، عراق سے نجد، اور نجد سے حجاز کا راستہ کھل جائے گا یہی وہ راستہ تھا جو خلفاء اور شاہان اسلام کے زمانے میں مستعمل تھا آج کل ہندوستان میں بھی خشکی کے راستہ سے حج کے انتظامات کا اعلان اسی مستقبل کا دیا چاہئے۔

کھانا۔ درالامان میں واپس پہنچ کر کھانے کی میز پر گئے ابتداءً شور و غیرہ تو انگریزی مذاق کی چیزیں تھیں، مگر اس کے بعد وہی مشرقی، بلکہ ہندوستانی کھانے تھے، کھانوں کے لحاظ سے ہندوستان اور افغانستان میں فرق محسوس نہیں ہوتا، بجز اس کے کہ وہاں مہرچ نہیں کھائی جاتی بلکہ اس کے اقسام بھی ہندوستان ہی کی طرح تھے، گوشت اور سالن بھی ہندوستان ہی جیسے ایک قسم کے پلاؤ کا نیا نام مسان بتایا گیا، البتہ بیچاری دال ایسی چیز ہے جو ہندوستان کے باہر نہیں پائی جاتی افغانستان میں بھی نہیں۔ کھانے پر خاکسار ڈاکٹر اقبال، سردار مسعود پروفسر ہادی غلام سونہا، بیرسٹر سردار فیض محمد خاں، استاد نواز خاں اور سردار خاں گویا تھے۔

حضرت نور المشائخ۔ ڈاکٹر صاحب نے ۴ بجے حضرت نور المشائخ سے ملاقات کا وقت مقرر کرایا تھا، میں بھی ساتھ گیا، یہ حضرت نور المشائخ وہی ہیں جو ہندوستان میں ملائے شور بازار کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کا اصلی نام فضل عمر ہے، مشائخ میں سے ہیں طریقہ مجددی ہیں شہر کابل اور قبائل میں اور شاہی فوج میں بکثرت ان کے مرید ہیں ۱۹۱۷ء کی جنگ افغانستان و انگریزوں میں یہ بھی جنرل نادر خاں مرحوم کے ساتھ جہاد میں شریک تھے، اور قبائل کو اپنی تقریر اور اثر سے افغانی لشکریں شرکت پر آمادہ کرتے تھے، افغانستان کی اس جنگ آزادی میں ان کا بھی خاص حصہ ہے۔

ہندوستان میں بھی ان کے مرید ہیں، کاٹھیاواڑ میں کچھ پہچان ہیں وہ ان کے مرید ہیں، شاہ امان اللہ خاں کے اخیر عہد میں یہ ہندوستان چلے آئے تھے اور کہا جاتا ہے کہ امان اللہ خاں نے اپنے اصلاحات کے اجراء کے معاملہ میں جب اعتدال کی حد سے آگے قدم رکھا تو وہ شاہ موصوف سے خفا ہو کر افغانستان سے باہر چلے گئے اور عہد کیا کہ جب تک کہ امان اللہ خاں وہاں ہیں وہ وہاں نہیں جائیں گے چنانچہ بچہ سقا کے پورے عہد میں وہ ہندوستان ہی میں رہے ان کے بھائی ان کو لینے آئے بھی تو نہیں گئے نادر خاں کی کامیابی کے بعد یہ افغانستان واپس گئے حکومت نے ان کا بڑا خیر مقدم کیا اور ان کو وزیر عدالت مقرر کیا اور ان کے بھائی محمد صادق خاں مجددی کو سفیر بنا کر مصر بھیج دیا۔

حضرت نور المشائخ کا خطاب غالباً حکومت موجودہ کا عطا کردہ ہے، اور اب وہ اسی نام سے وہاں پکارے جاتے ہیں اور حضرت صاحب شور بازار بھی کہے جاتے ہیں، اُنھوں نے وزارت عدل کا کام کچھ دنوں تک انجام دیا، مگر پھر اپنی ور ویشی اور طریقہ ارشاد کے مسلک کے خلاف سمجھ کر عملاً اس سے دست کش ہو گئے، حکومت نے بھی گو عملاً اُن کے استعفیٰ کو قبول کر لیا تھا مگر سما اب بھی وہ وزیر عدل تھے اور اُن کے ساتھ اُن کے داماد مولنا فضل احمد مجددی معین وزارت عدل تھے اور وہی اس محکمہ کے کام کرتے تھے اس وقت تک یہی صورت حال تھی۔ ان کا مکان پرانے شہر کے اندر ایک گلی میں ہے، موٹر ایک گلی کی موٹر پر جا کر کھڑا ہو گیا اور میں اور ڈاکٹر صاحب اُتر کر گلی میں گئے افسوس ہے کہ گلیاں صاف نہ تھیں اور بیت الخلا بنانے کا طریقہ اچھا نہیں بہر حال گلی کے اندر ایک مکان کے پاس جا کر ٹھہرے دروازے پر کچھ اور لوگ بھی پہلے سے منتظر تھے مکان ہر قسم کے تزک و احتشام اور طاہری آراستگی سے خالی تھا بالکل درویشانہ تھا۔ باہر نشست گاہ بھی نہ تھی زمانہ مکان تھا جہاں پردہ کرا کر ہم لوگوں کو اندر آنے کی اجازت ملی مولنا فضل احمد صاحب ہم کو اندر ایک لمبے کمرہ میں لے گئے جس میں ایک طرف ایک پلنگ اور باقی زمین میں سادہ فرش بچھا تھا، پلنگ پر ملا صاحب تشریف فرما تھے ہم لوگ فرش پر جا کر بیٹھے ملا صاحب اپنی جسامت میں ہمارے مولنا شوکت علی سے کم نہیں ابھی تک سراور

دارُصی کے بال سیاہ ہیں، پاؤں میں کوئی تکلیف تھی جس کے سبب چلنے سے اس وقت معذور ہو رہے تھے ڈاکٹر صاحب سے یہ ایک دفعہ لاہور میں مل چکے تھے، مجھ سے ملاقات نہ تھی مجھ سے پوچھا کہ وطن بہا رہے؟ میں نے کہا جی ہاں وہ ہندوستان کے اکثر علما و مشائخ سے واقف تھے میرے نام کی مناسبت سے مولانا شاہ سلیمان صاحب پھلواروی کو دریافت کیا میں نے ان کی خدمت میں اپنی خصوصیات خاندانی کا ذکر کیا پھر میں نے کہا آپ بھوپال کے حضرت شاہ ابوالاحمد صاحب مجددی رحمۃ اللہ علیہ سے واقف ہیں فرمایا ہاں میں نے کہا میرے بھائی مرحوم مولانا حکیم سید ابوصیب صاحب مجددی ان کے خلیفہ تھے پھر میں نے اپنے ایک عزیز دوست حافظ فضل الرحمن صاحب ندوی امام مسجد درگاہ حضرت مجدد صفا رحمۃ اللہ علیہ واقع سرہند کا سلام اُن کو پہنچایا انھوں نے اس کا جواب دیا یہ سرہند حاضر ہوتے ہیں کچھ دیر تک ہندوستان کے بعض حالات اور بچہ ستار کے ہنگامہ سے نجات کے واقعات پر گفتگو رہی تھوڑی دیر کے بعد چائے پیش ہوئی اور ایک کشتی میں خشک میوے (بادام اور انجیر) تحفہ کے طور پر ڈاکٹر صاحب کو پیش کئے جس کے بعد ہم لوگ ان سے رخصت ہوئے۔

ہندوستانی پارٹی یہاں سے سیدھے اللہ نواز خاں کے مکان پر گئے افغانستان میں ہندوستانیوں کا اچھا خاصہ گروہ موجود ہے جس میں سے اکثر سلطنت کے مختلف عہدوں پر سرفراز ہیں ان میں سے دو صاحب

ذمہ دار صاحب منصب ہیں ایک شاہ جی سید عبداللہ نائب سالار
یہ پشاور کے رہنے والے ہیں ہجرت کے زمانہ میں افغانستان چلے گئے
تھے حکومت نے قدر دانی کی اور اُن کو اس بلند عہدہ تک پہنچایا دوسرے
یہ اللہ نواز خاں جن کا ذکر پہلے گزر چکا ہے یہ پہلے شاہی اسٹاف میں یاور
اول مقرر ہوئے تھے، اور اب وزیر امور نافعہ ہیں، ان دونوں کے علاوہ
بقیہ عہدہ دار تعلیمی، علمی اور انتظامی دائروں میں منسلک ہیں جن میں سے
ایک قابل ذکر نوجوان مقبول الحق صاحب غازی پوری ہیں یہ شہر غازی پور
کے قریب کے ایک گاؤں (بخشو پور) کے رہنے والے ہیں علی گڑھ مسلم
یونیورسٹی کے ایف ایس سی کے طالب علم تھے ۱۹۲۱ء میں ترک موالات
کر کے مولانا محمد علی مرحوم کی جامعہ میں آئے پھر ترک موالات کے پروگنڈے
کا کام کرتے رہے اسی اثنا میں افغانستان میں چند مسلمین کی ضرورت کا
اشتہار ہندوستان میں شائع ہوا جس کو پڑھ کر انھوں نے بھی درخواست
دی جو منظور ہوئی اور اس وقت سے آج تک اس ملک کی خدمت کر رہے
ہیں یہ پہلے ایک معلم کی حیثیت سے آئے لیکن اپنی محنت، کوشش اور
مطالعہ سے گوگرد سازی میں یہ ترقی کی کہ سرکاری دیاسلائی اور بارود
سازی کے کارخانوں میں داخل ہو گئے اور اپنی انتھاک کوشش سے
سرکاری دیاسلائی کے کارخانہ کو سابق جرمن ماہر گوگرد سے زیادہ کامیابی
کے ساتھ چلا رہے ہیں اسی طرح اور بہت سے ہندوستانی حضرات
قابل ذکر ہیں۔

ان ہندوستانی بھائیوں نے آج اپنی قدر دانی سے اپنے ان چند
 نووارد بھائیوں کے اعزاز میں امنڈ نوازاں کی کوٹھی میں شام کی چائے
 کی دعوت دی تھی کابل کے تمام ہندوستانی بھائی جمع تھے، جنگلی قدراً
 میرے انداز میں تنو دیڑھ سو سے کم نہ ہوگی جس وقت میں اور ڈاکٹر صاحب
 پہنچے ہیں اکثر ہمان آپکے تھے حکومت افغان کے افغان نمایندوں میں
 سے صرف سردار فیض محمد خاں وزیر خارجہ تھے، سردار اسعد صاحب
 وغیرہ پہلے ہی آپکے تھے اس کوٹھی کے احاطہ میں خاصہ بڑا میدان تھا۔
 جس میں اس پارٹی کا انتظام تنباچ میں فوارہ تھا جس کے چاروں طرف
 نووارد جہانوں اور خاص خاص لوگوں کی نشستیں تھیں۔

میدان میں جا بجا قرینہ سے مینیں لگائی گئی تھیں اور ان کے
 چاروں طرف کرسیاں بچھا دی گئی تھیں کھیک اور بسکٹ اور مٹھائیاں
 اور چائے سامان دعوت میں تھیں، مولانا سیف الرحمن صاحب مجاہد
 (سابق مدرس فتح پوری دہلی) اور مولانا منصور انصاری صاحب سے
 ملاقات ہوئی یہ دونوں بزرگ مجاہدین کے مشہور سرگروہ میں تھے،
 مولانا سیف الرحمن صاحب بڑے عالم ہیں دہلی کے مدرسہ فتحپوری
 میں ساٹھ سال مدرس اول رہ چکے ہیں ان کے سٹاگردوں کی بڑی
 تعداد ہے جنک عظیم کے زمانہ میں مولانا عبید اللہ صاحب سندھی
 اور یہ اور بعض دوسرے علماء سرحد چلے گئے تھے تاکہ وہاں ہندوستانی
 مجاہدین کو اس موقع سے فائدہ اٹھانے میں مدد دی جائے اب یہ

ساہ سال بے کابل میں گوشہ نشین ہیں اور مولانا عبید اللہ صاحب اب
جہاز میں تشریف رکھتے ہیں۔

مولنا سیف الرحمن صاحب نے اپنی جگہ سے اٹھ کر بڑی گرجوشتی سے
معافۃ فرمایا اور میری آمد پر خوشی ظاہر فرمائی مولنا انصاری صاحب نے
بھی پر تپاک خیر مقدم کیا، سرحد میں مولنا اسماعیل شہید رحمۃ اللہ اور سید احمد
بریلوی کے متقین کی جو جماعت مجاہدین ہے اس کا مرکز چمر قند ہے اس
جماعت مجاہدین کے صدر اس وقت مولنا بشیر صاحب ہیں وہ بھی یہاں
تشریف رکھتے تھے۔

ایک لطیفہ یہ ہوا کہ کسی نے وہاں کی اس الکتوبر کی سردی میں جو
ہمارے ہاں کے دسمبر کے برابر تھی، فوآرہ کھول دیا لیکن سید اس مسعود صاحب
کے کہنے سے جو اس وقت مبتلائے زکام تھے وہ بند کر دیا گیا اس موقع پر
سردار فیض محمد خاں نے ہمانوں کی طرف خطاب کر کے برجستہ یہ شعر پڑھا
جس کا پہلا مصرع تو کسی اور شاعر کا ہے اور دوسرا ان کا ہے

گو ہر شہوار فی ساز و نثارِ مقدمت
ورنہ از فوآرہ مقصودِ دگر کے وارِ آب

ہم میں شاعر تو ڈاکٹر اقبال صاحب ہی تھے ان سے دوستوں نے
جواب کا اصرار کیا انہوں نے تھوڑی دیر کے بعد پہلا مصرع بدل کر

۱۰ حضرت مولانا عبید اللہ صاحب سندھی سلمۃ میں اتقالی فرما گئے۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون

اس کا جواب لکھا، جو مجھے پورا یاد نہیں رہا۔

..... می شمارد قدر احسان شما

ورنہ از فتارہ مقصود دگر کے دارد آب

چائے سے فارغ ہو کر مجمع کا نوٹو لیا گیا اور تعجب ہے کہ علمائے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا اس کے بعد ہندوستانیوں کی طرف سے مولوی بشیر صاحب نے جہانوں کے خیر مقدم کی تقریر فرمائی جس میں پہلے حکومت افغانستان کا شکریہ ادا کیا، اور وہاں کی موجودہ حکومت کی تحسین کی اور ہندوستانیوں کے ساتھ اس کی قدر دانیوں کی تعریف کی اور پھر ہندوستان کے حالات کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ ”یوہی کی کوئی وجہ نہیں مصیبت ہی کے بعد راحت آتی ہے“ جہانوں کی طرف سے جوابی تقریر کا فرض میں نے ادا کیا جس کا ایک فقرہ صرف مجھے یاد ہے کہ میں نے اپنے ہندوستانی بھائیوں کو خطاب کر کے کہا کہ ”تاریخ میں ہندوستان نے افغانستان کے معاملہ میں کئی دفعہ گناہ کا ارتکاب کیا ہے، اب وقت ہے کہ ہمارے یہ بھائی اپنے حسن خدمات سے ان گناہوں کا کفارہ ادا کریں۔“

میرے بعد ڈاکٹر اقبال صاحب نے مختصر تقریر کی اور اسی پر جلسہ ختم ہوا اور ہم لوگ اپنے قیامگاہ کو واپس آئے۔

واپسی کا پروگرام۔ میرا ارادہ تھا کہ ابھی کابل میں چند روز اور ٹھہروں اور پھر پشاور ہی کے راستے سے واپس جاؤں مگر معلوم ہوا کہ سیدراس منٹو صاحب

مسلم یونیورسٹی کے ضروری کاموں کے سبب سے ۴ نومبر کو علی گڑھ قطعاً منع جانا ہے اور ڈاکٹر صاحب کو غزنین کی زیارت کا شوق ہے، اس لئے دکن کی کار راستہ غزنین، قندھار اور چین ہو کر مقرر کیا گیا ہے، ان قدیم شہروں کی غیر متوقع زیارت کا شوق مجھے بھی ہوا، اس لئے کابل میں مزید قیام کا خیال ترک کیا اور دوسرے رفقاء کے ساتھ میں نے بھی اسی راستے سے واپسی کا عزم کیا،

ڈاک۔ افغانستان سے ہندوستان کو ہفتہ میں دو روز ڈاک جاتی ہے، محکمہ ڈاک کی اپنی لاریاں ہیں جن پر ڈاک پٹا در کتبہ بھی جاتی ہے ۲۸ اکتوبر کی صبح کو اٹھ کر سب سے پہلے ہندوستان چند خط لکھے جن میں سے ایک برادر م حکیم عبدالغفری صاحب ندوی کو لکھا جس میں راستہ کے تغیب کی اطلاع دی اور لکھا کہ ناظم صاحب جمعیتہ العلما سے صوبہ سرحد کو مطلع کر دیں ان کے مجوزہ جلسہ میں شرکت سے معذوری ہے۔

افغانستان میں ابھی تک کارڈ ایڈر لفافوں کا رواج نہیں ہوا ہے صرف ٹکٹوں کا رواج ہے ٹکٹ مختلف قیمتوں اور رنگوں کے نہایت خوبصورت ہیں جو وہیں کابل کے سرکاری مطبع میں چھپتے ہیں ٹکٹوں پر بیچ میں افغانستان کے سرکاری علم ”مہراب و منبر“ کی تصویر ہوتی ہے، نیچے ”پست دولت افغانستان“ اور اوپر فرینچ میں ”پوسٹ افغانیس“ اور گوشوں میں ٹکٹوں کی قیمت درج ہوتی ہے۔

اب چونکہ واپسی کا عزم ہو چکا تھا، اس لئے ایک دو دن میں

۵۰
یہاں کے قابل دید مقامات کی سیر کر لینی تھی ہمارے قیام گاہ سے قریب
موزہ کابل (میوزیم) یعنی کابل کا عجائب خانہ تھا اس لئے سب سے پہلے
ادھر ہی کا رخ کیا۔

موزہ کابل۔ یہ عجائب خانہ دارالامان میں ہے اور امیر امان اللہ خاں
کی تاسیسات میں سے ہے، بچہ سقا کے عہد میں اس عجائب خانہ کی چیزوں کو
بھی صدر مہینہ چا مجھے بتایا گیا کہ یہاں جو محبسے تھے ان کو بت سمجھ کر توڑا پھوڑا
گیا کچھ چیزیں شخصی تصرف میں بھی آگئی تھیں شاہ نادر خاں نے اپنے قتل کے
بعد دوبارہ اس عجائب خانہ کو ترتیب دیا اور دوبارہ غارت کردہ چیزوں کو
مختلف تدبیروں سے یہاں یکجا کر دیا۔

ابجے دن کو سردر خاں گویا کے ساتھ میں اس عجائب خانہ میں گیا،
باشا، اللہ پتھر کی نہایت عمدہ و دو منزلہ مختصر عمارت تھی عمارت کا طول
زیادہ اور عرض کم تھا دروازہ بھی شاندار تھا، دروازہ پر ایک سنتری
کھڑا پہرہ دے رہا تھا مدیر صاحب میوزیم سے تعارف ہوا، پھر چیزوں کے
دیکھنے میں مصروف ہوا، بلند دروازہ کے دونوں طرف دیواروں میں خطاطیوں
کے نمونے آویزاں ہیں نیچے دیوار سے لگا کر چند سنگی کتبے رکھے ہیں جن میں سے
ایک شاہ جہاں کا ہے اس پر شاہ جہاں کے کابل آنے کی یادگار تاریخ
منقوش ہے اس کتبہ کی عبارت کی نقل پروفیسر ہادی صاحب نے جو
بعد کو یہاں اسی وقت تشریف لے آئے تھے لی ہے، دوسرا سنگی کتبہ
اوزنگ زیب عالمگیر کی مہمی مسجد کا ہے، دروازہ کے بعد چند زمینوں پر

چڑھ کر ایک مستطیل سائبان آیا جس کے دونوں طرف بہ ترتیب کمرے تھے اور ہر کمرہ کسی خاص چیز کے لئے تھا انھیں میں ایک دفتر کا کمرہ بھی تھا اس سائبان میں اسلام سے پہلے کے بتوں کے مجسمے تھے ان میں زیادہ تر بودھوں کے عہد کی یادگار تھے، بعض یونانی افنانی طرز کے نمونے تھے یہ کل مجسمے افنانستان ہی سے کھود کر لائے گئے ہیں۔

ایک کمرہ قدیم تصاویر کا تھا جس میں یہاں کے بہت سے امراء اور سلاطین کی تصویریں تھیں ایک کمرہ میں افنانستان کے پرانے ہتھیار رکھے تھے زندہ خود چار آئینہ سپر تلواریں تیغ، پرانی بندوقیں تھیں چار آئینہ مرثیوں میں سنا تھا گردیکھا ہیں، یہ سینہ پر باندھنے کا آہنی غلاف تھا سپاہی ان کو سینوں کے بجائے کے لئے اُن پر باندھتے تھے ان ہتھیاروں کو دیکھ کر تعجب ہوتا تھا کہ لوہے کے اس عظیم الشان بوجھ سے لد کر کیونکہ اُس زمانہ میں سپاہی لڑتے تھے مجھے بتایا گیا کہ بچہ سقا کے عہد میں اس کمرہ کی دو قسمی اور تاریخی چیزیں ضائع ہو گئیں اور یقین کیا جاتا ہے کہ وہ کہیں یورپ میں پہنچ گئی ہیں ایک بابر کا شاہ خنجر تھا اور دوسری سلطان بایزید درم کی زرہ تھی۔

مجمعوں کے سلسلہ میں سب سے عجیب چیز بلکہ شاید اسی عجائب خانہ کے ساتھ مخصوص چیز کا فرستان (جس کو اب امیر عبدالرحمن خاں کی فتح کے بعد نوبستان کہتے ہیں) کے قدیم مذہب کے بت تھے خاص قسم کی موٹی لکڑیوں کی تقاطیع سے مختلف شکلیں بنائی گئی تھیں ان میں سب سے زیادہ عجیب لڑائی

کے دیوتے کا مجسمہ تھا، لکڑی کے قوی میکل گھوڑے پر لکڑی کا یہ تنومند اور قدآور دیوتا سوار تھا اسی طرح دوسرے کاموں کے الگ الگ دیوتاؤں کی مناسب شکلیں تھیں یہ شکلیں لکڑی کو کھود کر یا پھیل کر نہیں بنی ہیں بلکہ لکڑی کے بڑے بڑے ٹکڑوں کو کاٹ کر اور ایک دوسرے سے جوڑ کر بنائی گئی ہیں۔

بڑے ہال میں پتھر کا ایک بڑا پیالہ رکھا تھا جس کے چاروں طرف کسی خانقاہ اور مدرسہ کے اوقاف کی سند کو خوبصورت حروف میں کھود کر یا وقف کے ثبوت کو دوام بخشا گیا تھا، مگر یہ نہیں سمجھا گیا کہ یہاں خدا کے سوا دوام کس کو ہے چنانچہ نہ اس جائیداد کا پتہ ہے نہ اس خانقاہ کا اور نہ اس مدرسہ کا یہاں تک کہ اس کی سنگی سند کی عبارت پڑھ لینا بھی آج آسان نہیں۔

ایک دوسرے کمرہ میں وہ پرانے سکے تھے جو افغانستان میں برآمد ہوئے ہیں ان میں یونانی اور بودھ عہد کے کچھ سکے تھے کچھ قدیم اسلامی عہد کے تھے جن میں سب سے پرانا سکہ عبدالملک کا تھا اس کے بعد کے اموی اور عباسی سکے تھے غزنویں اور غور کے سلاطین کے سکے بھی موجود تھے پھر خود افغانستان کے سکوں کے نمونے تھے ایک کمرہ میں قلمی کتابیں شوکیں میں رکھی تھیں یہ وہ کتابیں تھیں جو اپنے حسن خط بالخصوص ویر کے لحاظ سے نمائش کے قابل تھیں ان کتابوں میں حسب ذیل نسخے ذکر کے قابل ہیں۔

(۱) صُور الکو اکب عبد الرحمن صوفی خط قدیم تصاویر عمدہ
 (۲) دعوت الکو اکب والطلسمات امام رازی اس کتاب کو دیکھ کر
 یقین آجیا کہ علامہ ابن تیمیہ نے ان پر اس کتاب کے متعلق جو اعتراضات کئے
 ہیں صحیح ہیں اس کی پہلی فصل علم کی فضیلت میں ہے

(۳) تاریخ سلطان ابوسعید بہادر خاں نسخہ ۱۹۱۱ء کا لکھا تھا۔
 (۴) ثنوی مولانا روم کا ایک نسخہ جس کے شروع میں بیرم خان
 کے ہاتھ سے عبارت لکھی ہوئی ہے۔

(۵) ذخیرۃ الملوک شیخ علی ہمدانی المتوفی ۷۷۱ھ در اخلاق۔
 (۶) معاف بن اسماعیل المتوفی ۷۷۳ھ کی انس المتقصین یہ وعظ
 و اخلاق میں ہے۔ اس میں تین سو حدیثیں اور تین سو حکایات و ابیات
 ہیں نسخہ ۷۷۳ھ کا ہے۔

(۷) سلسلۃ الذہب اور سبحة الابرار بخط مصنف (مولانا جامی)
 (۸) بہارستان جامی بخط خوب علی رضا اکابر نسخہ ۹۸۲ھ کا
 مصنف کا سال وفات ۹۸۵ھ ہے

(۹) جامی کی ہفت اورنگ اور نظامی اور خسرو کے غزلیوں کا
 مجموعہ جس کو ۹۹۹ھ میں ہرات کے مشہور خطاطوں نے نہایت خوبی اور
 لطافت کے ساتھ لکھا ہے، جابجا تصاویر ہیں اور اوراق مٹلا ہیں۔
 (۱۰) بیدل کے کلیات کا نہایت عمدہ نسخہ جو فرغانہ سے حاصل ہوا ہے
 (۱۱) دیوان حافظ کا ایک عجیب و غریب نسخہ، یہ نسخہ ۹۹۷ھ میں

سلطان حسین مرزا کے عہد میں تیار ہوا۔ سرتاپا مصطور اور مطلق ہے۔
(۱۲) مواہب لدنیہ کا ایک عمدہ نسخہ جس کی خصوصیت یہ ہے کہ
اس کے آخر میں خاص اور نگ زیب عالمگیر کے قلم کی عربی عبارت ہے۔
دو امارتوں میں کچھ غیر مرتب کتابیں بھی پڑی ہوئی تھیں مگر ان
میں کوئی قابل ذکر کتاب نہ تھی۔

ایک اور کمرہ تبرکات خانہ کے نام سے تھا، اس میں قرآن پاک کے
مختلف قلمی نسخے تھے ایک بہت بڑا نسخہ تھا، جس کا خط نہایت جلی اور
کاغذ ریشمی معلوم ہوتا تھا سنا کہ یہ روس سے ملا ہے، ہرن کی کھال کے کاغذ
پر قرآن پاک کے تین نسخے بخط کوفی تھے جن میں سے ایک حضرت عثمان
ؓ کی طرف اور دوسرا حضرت امام حسنؑ کی طرف منسوب تھا، ان میں سے
ایک کبھی ہندوستان میں بھی رہ چکا تھا اس پر لکھا تھا ”در عہد فتح سیر
داخل کتب خانہ نواب قطب الملک شد“

صدر اعظم کی آمد۔ ابھی عجائب خانہ کی کچھ اور چیزیں دکھانی باقی تھیں
کہ خبر آئی کہ سردار محمد ہاشم خاں صدر اعظم مہمانوں کی بازدید کے لئے تشریف
لا رہے ہیں اس لئے جلد واپس آگیا واپسی کی تھوڑی دیر کے بعد سردار محمد
تشریف لائے ہم لوگوں نے دروازہ تک ان کا استقبال کیا اور پھر اوپر
دوسری منزل پر اپنی قیام گاہ میں لائے، دیر تک گفتگو جاری رہی، سید
راس مسعود صاحب نے ملک کے معنیات اور سڑکوں کی تعمیر پر زور دیا
اور فرمایا کہ معنیات سے میرا مقصود جواہرات کی کانیں نہیں جن کی قدر و

اب باقی نہیں رہی ہے بلکہ اس سے مقصود مختلف دھاتیں اور خصوصاً
 پٹرولیم ہے جس کی کثیر مقدار ان پہاڑوں اور وادیوں کے اندر معلوم
 ہوتی ہے، صدر اعظم نے اس تجویز کی تائید کی لیکن فرمایا کہ دقت یہ ہے
 کہ یورپ کے ماہرین کا بار بار تجربہ ہو چکا ہے کہ وہ سخت مشروط اور
 گرانقدر معاوضوں کے باوجود اپنا کام دیانتداری سے نہیں کرتے
 ان میں سے اکثروں سے حکومت کو دھوکا اٹھانا پڑا ہے اور مثال کے
 طور پر چند واقعات بیان کئے (سید را اس مسعود صاحب نے کہا کہ میں
 ایسے چند دیانت دار ماہرین کا انتخاب اپنی یونیورسٹی کے ذریعے سے
 کرا سکتا ہوں جن پر واقعی طور سے ہم بھروسہ کر سکتے ہیں)۔
 سڑکوں کی تعمیر کے سلسلہ میں صدر اعظم نے کہا کہ ہماری حکومت
 اس کام سے غافل نہیں ہے افغانستان کے قلب میں کابل سے
 مزار شریف تک کا راستہ ابھی بن کر تیار ہوا ہے جس کے افتتاح اور
 معائنہ کے لئے میں کل مزار شریف جا رہا ہوں اس سڑک کے بن جانے
 سے ہینوں کا راستہ اب دنوں میں طے ہو گا، دوسرا راستہ کابل سے
 پشاور تک زیر تعمیر ہے، یہ نیا راستہ اس پرانے راستہ سے جدھر سے
 آپ لوگ آئے ہیں بہتر اور مختصر ہو گا، ذکر کیا کہ ایک جاپانی ایجنٹ
 ابھی آیا تھا اس کو یہاں آتے ہوئے لوگوں نے بہت کچھ ڈرا دیا تھا مگر
 اس نے تنہا موٹر پر تمام ملک کا دورہ کیا اور واپسی پر اس نے ملک کے
 امن و امان کی بہت تعریف کی اور شکریہ ادا کیا۔

ڈاکٹر اقبال صاحب نے بھی سڑکوں کی تعمیر کے کام پر بہت زور دیا اور فرمایا کہ آئندہ تجارتی آمدورفت کے سلسلہ میں سنٹرل ایشیا اور افغانستان کی مرکزیت یقینی ہے اس کے بعد ریلوے کا ذکر آیا اور بتایا گیا کہ اس ملک میں ریلوے کا جاری کرنا اس وقت تک مناسب نہ ہوگا، جب تک یہ پورے طور پر طاقتور نہ ہو جائے۔

گفتگو میں دو بج گئے ہم لوگ ساتھ کھانے کو اٹھے کھانے کا کمرہ نیچے تھا انٹرکریجیج گئے صدر اعظم صاحب نے بھی ہم لوگوں کیساتھ کھانا کھایا کھانے پر حکومت کے مالیات پر گفتگو ہوتی رہی، اسی سلسلہ میں ریاست عالیہ حیدرآباد کے مالیات کا ذکر آیا، اور بتایا گیا کہ اس موجودہ اقتصادی تباہی میں بھی اس کے مالیات کو صدمہ نہیں پہنچا۔

کھانے کے بعد سردار ہاشم خاں تشریف لے گئے سردار موصوف ہی اس وقت افغانستان میں سب سے بڑی عملی طاقت ہیں، ملنے میں نہایت بااخلاق ہیں لیکن ماتحتوں سے کام لینے میں اور اپنے فیصلوں میں پوری طرح مضبوط ہیں اس لئے رعایا اور سرکاری ملازموں پر ان کا رعب بیٹھا ہوا ہے، اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ انگلستان یا فرانس کے صدر اعظموں کی طرح سلطنت کی اصل انتظامی طاقت کی کنجیاں انھیں کی سخت مٹھیوں میں بعض خاص حالات و کائنات۔ سردار فیض محمد خاں وزیر خارجہ اور انڈوز خاں وزیر نافہ اکثر تشریف لاتے تھے اور افغانستان کے ہر قسم کے انتظامی و تعلیمی مباحث پر ان سے گفتگو ہوتی رہتی تھی بچہ سقا کے

ہنگاموں کے فرو کرنے اور نادر خاں مرحوم کی کامیابی کی کچھلی تاریخ کے مخفی اوراق اللہ نواز خاں کے سینے میں بند ہیں اور یہ وہ واقعات ہیں جو اس ہنگامہ کی تاریخوں میں درج نہیں ہوئے، ہم میں سب سے زیادہ سیدراس مسعود صاحب کو ان واقعات سے دلچسپی تھی ان دونوں صاحبوں سے پوچھ پوچھ کر پروفیسر ہادی صاحب کے ذریعہ سے اس کو وقتاً فوقتاً قلم بند کراتے رہتے تھے، اور عجب نہیں کہ کسی وقت وہ ان کو شائع کرائیں۔

اس وقت ان دونوں صاحبوں نے امان اللہ خاں اور جنرل غلام نبی خاں مرحوم کے تعلقات کے متعلق بعض اہم کاغذات کے فوٹو ہم کو دکھائے جن میں سے میں نے صرف ایک خط دیکھا یہ شاہ امان اللہ خاں کے دستِ خاص کا لکھا ہوا اور غلام نبی خاں کے نام تھا، اس خط کو ”عزیزم غلام نبی خاں“ کے شروع کیا گیا تھا جس کا مضمون یہ تھا ”میں اعلانات کی کچھ مقدار بھیجتا ہوں تم اُن کو پھیلاؤ اور اعلانات جس قدر مزید ضرورت ہوگی بھیج دوں گا“ میں نے سفیر روس سے ملاقات کی خواہش کی ہے، اس ملاقات کے نتیجے سے بعد کو مطلع کروں گا۔“

ان کے علاوہ بعض تصاویر اور فوٹو تھے جن کو میں نے نہیں دیکھا اس وقت تین بجے علیحضرت شاہ نادر خاں مرحوم سے میری ملاقات کا وقت مقرر تھا، اس لئے میں اٹھ آیا اور مزید واقعات و کاغذات کا مجھے علم نہیں ہوا، پہرے دوسرے رفقا پہلے ہی سے مل چکے تھے، اس لئے

شاہِ نادر خاں شہید سے ملاقات

سرور خاں گویا مجھے اپنے ساتھ قصرِ دلکشائے چلے، یہ قصر ایک زمانے سے شاہانِ افغانستان کا محلِ اقامت ہے یہ مقام شہرِ کابل کا بہترین حصہ ہے بلند عمارتیں موجودہ طرز کی عالی شان دکانیں سڑک وسیع اور صاف اسی کے قرب و جوار میں وزارتِ خانے اور اکثر اعلیٰ سرکاری دفاتر ہیں تھوڑی دیر کے بعد قصرِ دلکشا آگیا اول وسیع باغ ہے اس کے بعد گوشوں میں مختلف شاہی ضرورتوں کی عمارتیں ہیں ان کو طے کرنے کے بعد قصرِ دلکشا کی اصلی عمارت آئی اس کے صدر دروازہ پر سستروں کے پہرے لگے ہوئے تھے، موڑے اُترتے ہی ایک سائبان میں آدمی داخل ہو جاتا ہے۔ یہ سائبان نہایت وسیع اور اس کی چھت نہت بلند ہے دروازہ کے اوپر بلندی پر لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا کتبہ خوش خط بہت جلی، سیاہ خرفوں میں لکھا ہوا ہے جس پر اندر داخل ہونے والے کی نظر تو نہیں پڑتی کیونکہ اس وقت ادھر اُس کی پشت ہوتی ہے، لیکن اُدھر سے واپس لوٹتے وقت فوراً اس پر نظر پہنچ جاتی ہے، اس مقام پر اس کلمہ کو پڑھ کر روح کو بامیدگی ہوتی ہے میری نظر بھی واپسی ہی کے وقت اُس پر پڑی،

سائبان سے گذر کر ایک وسیع زمین ملازمینہ ختم ہونے پر سہ طرفہ سائبان اور ان سائبانوں کے بعد مختلف کمرے دکھائی دئے، جو اکثر

بند تھے، پوری عمارت وسیع بلند، شاندار اور روشن ہے، مکلفات اور زیب و زینت کی ظاہری فحاشیت سے بری ہے! ایں ہمہ سادگی مجھے اس میں بڑی جلالت نظر آئی اور احمد شاہ درانی سے لے کر امیر عبدالرحمن خاں تک کی تاریخ سامنے آگئی حالانکہ یہ محل قدیم نہیں ہے اور بہت بعد کی تعمیر ہے تاہم آج ان کے تحت کا جلوہ ہمیں نظر آتا ہے بہر حال زینہ کے خاتمہ پر سرِ شریفیاتی موجود تھے، انہوں نے خیر مقدم

کیا، اور اس کے بعد سائبان کے اوپر ہو کر ایک کمرہ میں لے گئے، وہاں ایک گول میز کے گرد چند کرسیاں بکھی تھیں جن میں سے ایک پر میں بیٹھ گیا اسی کمرہ سے متصل ایک دوسرا کمرہ نظر آ رہا تھا جس کا دروازہ بند تھا چند منٹ کے بعد وہ دروازہ کھلا اور مجھے اس کے اندر جانے کو کہا گیا میں نے اس دروازہ میں قدم رکھا تو دیکھا کہ اس کمرہ کی کھڑکیاں کسی کسادہ منظر کی طرف کھلتی ہیں اور شاہِ مغفور اُدھر متوجہ ہیں مگر میرے داخلہ کے ساتھ ہی وہ میری طرف پھر گئے وہنی چھریا جسم بدن پر سوٹ سر پر افغانی ٹوپی، اور لبوں پر ہلکا بستم، دیکھنے کے ساتھ السلام علیکم فرمایا اور خوش اخلاقی سے جھک کر مصافحہ کیا یہاں مستطیل میز کے طول میں خود کرسی پر بیٹھ گئے اور مجھ سے ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا!

سب سے اول سفر میں میری تاخیر کے اسباب دریافت فرمائے میں نے عرض کی کہ اولاً میری زندگی کی تاریخ اس قدر صاف نہیں کہ مجھے حدود ہند سے جلد نکلنے میں آسانی ہو دوم میری ایک چھوٹے سے مقام

(اعظم گڈھ) میں اقامت اور صوبہ کے مرکزی شہروں سے دوری بھی پاسپورٹ کی تاخیر کا باعث ہے، باتیں کرنے میں یہ بالکل محسوس نہیں ہو کہ اس وقت میں اس سے باتیں کر رہا ہوں، جو ایک کروڑ نفوس پر حکمران ہے بلکہ پوری طرح مساوات اور حسن خلق کا تصور سامنے تھا کمرہ میں میرے اور شاہ مغفور کے سوا کوئی دوسرا تنفس نہ تھا اس لئے طرفین کو اظہار مطالب میں کوئی باک نہ تھا ملاقات کوئی آدھ گھنٹہ تک رہی اور اس عرصہ میں صرف تین موضوعوں پر گفتگو رہی۔

سب سے پہلے ایک سلسلہ تقریریں میں نے کہا کہ میں جس وقت پشاور سے روانہ ہو رہا تھا تو یہ سن کر کہ میں شاہ معظم کی دعوت پر کابل جا رہا ہوں میرے ارد گرد کچھ لوگ کھڑے ہو گئے جن میں ایک آفریدی پٹھان بھی تھا اس نے پشتو میں مجھ سے کچھ کہا جس کو میں سمجھ نہیں سکا میرے دوستوں نے اس کا ترجمہ کیا تو معلوم ہوا کہ وہ ایک مختصر مخلصانہ پیغام ہے جس کو وہ میرے ذریعہ آپ تک پہنچانا چاہتا تھا اور اس کا تعلق سرحدات کے افغانی طرز سیاست سے تھا پھر اس بارہ میں میرا جو اسلامی فرض تھا خدا کا شکر ہے کہ میں نے اس کو بطریق حسن انجام دیا اور اعلیٰ حضرت نے اس کو پوری توجہ سے سنا اور اس کے متعلق اپنے خیالات بہت مختصر لیکن نہایت مشرق طریق سے ظاہر فرمائے میں نے اپنی گفتگو میں سرحد کے آزاد علاقوں کو افغانستان کی چار دیواری قرار دیا تھا فرمایا کہ ”جس کو اس چار دیواری کے اندر ہی رہنا ہے وہ کیونکر گیوا“

۶۱
 دے سکتا ہے کہ اس چہار دیواری کی ایک اینٹ بھی اپنی جگہ سے کھسکے۔

گفتگو کا دوسرا اہم اور طویل موضوع مسئلہ تعلیم تھا، میں نے اس کے متعلق اپنے مفصل خیالات عرض کئے اور بتایا کہ افغانستان کے لئے کس قسم کی تعلیم موزوں ہے اور خصوصیت کے ساتھ میں نے یہاں کی عربی و مذہبی تعلیم کے اصول و اسلوب و طریق پر بحث کی اور دکھایا کہ موجودہ عربی تعلیم میں کیا نقائص ہیں اور ان کی اصلاح کی کیا صورت ہے، نیز یہ کہ جب تک اس قسم کی عربی و مذہبی تعلیم کا نصاب جاری نہ ہوگا علما میں موجودہ نصاب کے اندر سیاسی و اجتماعی اصلاحات کی طرف میلان اور نوجوان افغانوں میں مذہبی شیفتگی و پابندی کا احساس پیدا نہیں ہو سکتا، اعلیٰحضرت مرحوم دیر تک میرے خیالات کو توجہ سے سنتے رہے اور ان کی تحسین فرمائی اور ان کی ضرورت ظاہر کی اور دریافت فرمایا کہ کیا اس طرز پر ہندوستان میں کوئی مذہبی درسگاہ قائم ہوئی ہے، میں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ کا نام لیا، اور اس کے کچھ حالات بیان کئے اور اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اس بیان سے خوش اور مسرور ہوئے۔ اس تعلق سے انھوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کے عام حالات اور خصوصاً سیاسی حالات دریافت کئے میں نے اس وقت مسلمانوں میں جو سیاسی افتراقات اور اختلافات ہیں ان کو افسوس کے ساتھ بیان کیا پھر انھوں نے ہندو مسلم تعلقات کی نسبت دریافت کیا اس کی جو

صورت حال مجھے معلوم تھی وہ عرض کی اعلیٰ حضرت مرحوم خود بھی ہندوستان کے حالات سے اچھی طرح واقف تھے یہاں کے اخبارات اور خاص خاص رسالے شاہی دارالتحریر میں آتے ہیں اور ان کی نظر سے گزرتے ہیں چنانچہ میں نے کسی بات میں معارف کا حوالہ دیا تو فرمایا کہ میں اس کو ہمیشہ پڑھتا ہوں۔

آخر میں ارشاد فرمایا کہ آپ ہندوستان میں جا کر میرے بھائیوں کو یہ پیغام پہنچا دیجئے کہ آج ہم کو اور ان کو اتفاق اور اتحاد کی سب سے زیادہ ضرورت ہے اور ایک دوسرے پر نکتہ چینی کے بجائے ایک دوسرے کی حالت کو درست کرنے میں معاونت کی جائے تو بہتر ہے۔

پھر فرمایا کہ میری کوشش ہے کہ افغانستان میں دین و دنیا کو جمع کروں اور ایک ایسے اسلامی ملک کا نمونہ پیش کروں جس میں قدیم اسلام اور جدید تمدن کے محاسن یکجا ہوں پھر فرمایا کہ میں دین و ملت کا خادم ہوں اور افغانستان کو صرف افغانوں کا ملک نہیں بلکہ مسلمانوں کا ملک سمجھتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ ہمارے مسلمان بھائی بھی اس کو اپنا ملک سمجھیں پھر فرمایا کہ میرے بھائیوں سے کہہ دیجئے گا کہ دنیا میں ایک نئے انقلاب کا مواد تیار ہو رہا ہے ضرورت ہے کہ مسلمان اپنی تعداد میں قضا اور تعلیمی استعداد اس کے لئے پہلے سے تیار کر لیں

اعلیٰ حضرت مرحوم نے چونکہ ڈیرہ دون میں تربیت پائی تھی اس لئے اردو بہت اچھی بولتے تھے ہم دونوں نے گفتگو کا آغاز گوفاریسی میں کیا لیکن

پھر بہت جلد اردو میں شروع ہو گئی جو آخر تک قائم رہی۔
 چلتے وقت پھر کھڑے ہو کر مصافحہ کیا اور کلمات رخصت ادا کئے
 جن کا میں نے مناسب جواب دیا، مرحوم نہایت شیریں اخلاق منکسر مزاج
 بر محبت اور رقیق القلب تھے ان کی آنکھیں مولانا محمد علی مرحوم کی طرح
 اشکباری کے لئے ہمہ وقت تیار رہتی تھیں۔

شاہ محمود خاں وزیر جنگ کے یہاں دعوت چلے

آج چار بجے شام کو سردار شاہ محمود خاں وزیر جنگ کے ہاں چلے
 کی دعوت تھی، قصر دلکشا سے سیدھے سردار موصوف کے یہاں روانگی ہوئی
 سردار خاں کو آیا ساتھ تھے سردار موصوف کا دولت خانہ اس سے قریب تھا
 قصر دلکشا سے نکل کر وزارت خانہ والی سڑک کو عبور کر کے سردار موصوف
 کا دولت خانہ آگیا، افغانستان کے مکانات کی یہ عجیب طرز تعمیر ہے کہ باہر
 صرف ایک چھوٹا سا دروازہ نظر آتا ہے، اندر قدم رکھنے کے بعد اس کی
 پوری عظمت معلوم ہوتی ہے، موڑ سے اتر کر اندر قدم رکھا پہلے کھیل کا ایک
 میدان ملا جس کو ”لان“ کہہ سکتے ہیں پھر ایک دروازے سے ایک زینہ
 تک پہنچے زینہ کو طے کرنے کے بعد پہلے ایک چھوٹا کمرہ (کلوک روم) ملا
 جس میں باہر سے آنے والے اپنے اور کوٹ اور لباس اتار دیں پھر اندر
 ایک بڑا ہال تھا جس میں مختلف میزوں کے گرد بیٹھنے والوں کے لئے کرسیاں
 بچھی تھیں پورا ہال آراستہ تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ ہم اس وقت یورپ کے
 ناگوشہ میں بیٹھے ہیں ایک طرف ایک میز پر ایک تازہ ایجاد برن محفل کا

تختہ زور رکھا تھا، دوسرے گوشہ میں لاسکی آوازوں کا صندوق تھا، تیسری طرف دوسرے کمرہ میں جانمازیں بھی رکھی تھیں اوپر پہنچنے کے ساتھ وزیر مہدوح نے اپنی فوجی خاکی وردی میں پیشوائی کی، میں نے اب تک عصر کی نماز نہیں پڑھی تھی وزیر صاحب اپنی مہربانی سے مجھے خود اپنے ساتھ لے کر اپنے غسل خانہ تک گئے وہاں ہر چیز مہیا تھی پانی کے پائپ اوہاٹو منہ دھونے کے ظروف مختلف اغراض کے تولے اور دیگر ضروری سامان وہاں سے نکل کر ان کے ڈریسنگ روم میں داخل ہوا اور وہاں سے پھر دوسرے پرائیوٹ کمرہ میں آکر نماز ادا کی غرض یہ ہے کہ اس سلسلہ میں وزیر مہدوح کے بیچ کے کمروں کے دیکھنے کا اتفاق ہوا وہ بھی نہایت سلیقہ سے آراستہ تھے تصاویر اور وہ بھی برہنہ تصاویر کی جو سنت یورپ بدولت ہمارے امراء کے دولت سراؤں میں داخل ہو گئی ہے وہ اس سے سراپا پاک تھے

اب تمام مہمان آپکے تھے، وزیر موصوف سب کو لے کر دوسرے کمرہ میں گئے وہاں ایک لمبی میز چھوٹوں اور بچوں سے لے کر کھڑی تھی مختلف رنگوں اور قسموں کے انگوروں کی بہار تھی، یورپین ذوق کی مٹھائیاں اور کیک اور بسکٹ وغیرہ تھے جن کی نسبت میرا خیال ہے کہ وہ کابل ہی کے بنے ہوئے تھے، پھر شایستہ لباس میں شایستہ اخلاق خادم چائے کی کشتیاں لے کر آئے اور چائے پی گئی، مہمانوں میں سزا۔ ہاشم خاں صدر اعظم اور دوسرے وزراء اور اعیان بھی موجود تھے۔

چائے سے فراغت کے بعد گفتگوؤں کا سلسلہ شروع ہوا میری زیر
 پرہیزوار ہاشم خاں، میر عطاء محمد رئیس اعیان اور مولانا فضل احمد صاحب
 نائب مدلیہ (اور اب وہ وزیر عدلیہ ہو گئے ہیں) تھے اس مناسب
 اجتماع کے موقع پر میں نے کابل میں مذہبی عربی تعلیم کے اصلاحات کی
 اسکیم کو پوری تفصیل کے ساتھ اُن کے سامنے رکھا اور بالآخر میں نے
 وض کیا کہ افغانستان ایک ایسی درسگاہ کے بغیر اصلاحات کے سلسلہ
 میں تاقیامت کامیاب نہیں ہو سکتا، صدر اعظم نے بعید توجہ سے ان
 نیالات کو سنا اور بالآخر فرمایا کہ کیا آپ ہم کو اس میں مدد دے سکتے ہیں
 میں عرض کی اپنی پوری طاقت اور استطاعت کو اس راہ میں صرف
 کر سکتا ہوں، بقیہ دو حضرات نے بھی پوری تائید کی اب مغرب کا وقت
 فریب تھا کچھ لوگ رخصت ہو گئے کچھ لوگ دوسرے کمرہ میں نماز مغرب
 کے لئے چلے گئے اور یہ بھی کہہ دوں کہ کچھ لوگ اپنی جگہ پر بیٹھے بھی رہ گئے۔
 نماز کے بعد شاہ محمود خاں نے لاسکلی کا صندوق کھولا تو اسکو کے
 سی روسی گانے کی آواز آئی، پھر ایران کا کوئی نغمہ سنائی دیا آواز صاف
 تھی اس لئے اس تماشے کو بند کر دیا گیا چلتے وقت سردار احمد شاہ نے
 وزیر دربار تھے اور رشتہ میں شاہ مرحوم کے چچا زاد بھائی اور سمدھی
 یعنی شاہ حال شاہ ظاہر خاں کے خسر تھے کل شام کو پھان آنے کی دعوت
 دی جس کو ہم سب نے قبول کیا۔

انجمن ادبی کی اعزازی و دعوتیں

ہزارکسٹنسی سردار شاہ محمود خاں وزیر حربیہ کے یہاں سلسلہ گفتگو اتنا ورازا ہوا کہ شام کے سات بج گئے اور ساڑھے سات بجے کابل کی انجمن ادبی نے جس کو یہاں کی رائل آکاڈمی کہئے نووارد ہندی مہمانوں کے اعزاز میں دعوتِ شب (ڈنر) کا انتظام کیا تھا چنانچہ ہم لوگ یہاں سے سیدھے کابل ہوٹل کو روانہ ہوئے جہاں اس ڈنر کا اہتمام تھا کابل ہوٹل کی عمارت اچھی خاصی نچھتے اور بلند ہے اور اس میں متعدد وسیع کمرے اور ہال ہیں ہم لوگ پہلے ایک بغلی کمرہ میں بٹھائے گئے اس کمرہ میں ہر طرف مہمانوں کے لئے کرسیاں کچھ تھیں اکثر جہان جو زیادہ تر اسی انجمن ادبی کے ارکان تھے پہلے ہی سے آپکے تھے کچھ لوگ بعد کو آئے۔

یہ انجمن ادبی موجودہ حکومت کی تاسیسات میں سے ہے ملک کے اکثر اعلیٰ علم و اصحابِ قلم اور تعلیم یافتہ نوجوان اس کے ارکان ہیں شہزادہ احمد علی خاں، ذانی جو اسلامیہ کالج لاہور کے تعلیم یافتہ ہیں اور دارالتحریر شاہی (سکریٹریٹ) کے ایک معزز منصب دار ہیں اس کے سکریٹری ہیں اس انجمن کی رکنیت ایک شاہی اعزاز ہے ہر رکن کو سلطنت کی طرف سے علمی وظیفہ ملتا ہے تاکہ وہ علم و فن اور شعر و سخن کی خدمت آزادی اور خوش دلی کے ساتھ انجام دے سکے یہاں تک کہ سرکاری ملازمین بھی جب اس انجمن کی رکنیت سے سرفراز ہوتے ہیں تو ان کی تنخواہ کے علاوہ وظیفہ

رقم الگ ملتی ہے ارکان میں بوڑھے بھی ہیں جوان بھی قدیم عالم بھی اور
جدید تعلیم یافتہ بھی مخلوق العلیہ بھی اور صاحب ریش و راز بھی شاعر بھی اور
نثر نویس بھی عربی و ان مضمون نگار بھی اور انگریزی فریچ اور جرمن زبانوں
کے مترجم بھی اس انجمن کا ماہانہ رسالہ کابل ہر مہینہ بہت آب و تاب سے
شائع ہوتا ہے۔

سب مہمانوں کے آنے کے بعد انجمن کے صدر نشین نے کھڑے ہو کر
فارسی میں خیر مقدم کا ایڈریس پڑھ کر سنا۔

خطابہ خیر مقدم جناب میں انجمن ادبی کابل

فضلاء محترم! اجازت دیجئے کہ افغانستان کے ادباء اور اہل قلم کی
یہ ادبی مجلس اپنے خلوص و محبت کے جذبات کو جناب کے سامنے پیش اور آپ کی
تشریف آوری پر اظہار شکر کرتے ہوئے خوش آمدید اور صفا آور دید کہے۔
ہندوستان کا وسیع ملک جو ہمیشہ سے نامور فاضلوں اور بڑے
بڑے ادیبوں کا گہوارہ رہا ہے اور جس نے اپنے آغوش میں بڑے بڑے
مشہور لوگوں اور معروف سخنوروں مثلاً سراپا دل بیدل صاحب اصفہانی
کیم سلیم طائب آملی فیضی فیاضی اور آخر میں شبلی نعمانی اور آج صاحبان
فکر بلند مثلاً مشہور اجتماعی فلسفی شاعر اقبال اور فرزندان جلیل القدر مثلاً
میراں مسعود علامہ سید سلیمان ندوی اور مشہور پروفیسر ہادی حسن کو پیدا کیا
یقیناً وہ خاک پاک ایشیا میں علم و فضل کا گہوارہ ہے اور ہم اس کو بڑے

لہ یہ تقریر ڈومبرٹلڈ کے رسالہ کابل میں زبان فارسی شائع ہوئے ہیں ہم ان کا ترجمہ سالہ نگار سے لیکر بیان دے کر کرتے ہیں

اقترام کی نظر سے دیکھتے ہیں ہندوستان کے افق کے روشن ستاروں نے ہمیشہ فضاے عالم پر پتو اٹکنی کی ہے اور ایشا و اہل مشرق کی عزت اور سر بلندی کے لئے بہت بڑی اور قیمتی خدمتیں اور کوششیں کر دکھائی ہیں۔ پس اگر ہم اس مشہور ملک کے آپ جیسے بزرگ و فرزانه فضلا، کو اپنے ملک میں دیکھتے ہیں تو یہ بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ ہم خوش اور مسرور ہو کر ایشیا کی بلند صلاحیت اور استعداد پر فخر کریں گے۔

ایشا عظمت گذشتہ ایشا ستون قدیم جو کسی زمانہ میں دنیا کے علم و تربیت کا گہوارہ اور فضل و ادب کا سرچشمہ تھا اور جس کے قیمتی ذخیرے آج تک دنیا کے موجودہ کی بہت سی ترقی یافتہ قوموں کو دہمہ بنائے ہوئے ہیں ممکن تھا کہ وہ ایشا موجودہ پستی و پسماندگی کی وجہ سے دوں سے فراموش ہو جاتا لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اہل ایشا میں جو قوم اس سرزمین کے نام تاریخ اور مفاخر کو زندہ اور روشن کرنے میں بے انتہا جدوجہد سے خدمت کر رہی ہے وہ ہندوستان ہی کے سچے اور نام آور فرزند ہیں۔

علی گڑھ کا عظیم الشان دارالعلوم (یونیورسٹی) جو فرزند ایشا کا بہترین علمی مرکز شمار ہوتا ہے وہ کشور ہند کے ایک فرزند نجیب سر عظیم کی بہت جواہردی اور مشرق دوستی کی ایک یادگار ہے، حضرت اقبال کے قیمتی آثار و تالیفات جن میں سے ہر ایک نے اخلاق سعی عمل اور اجتماع جذبات شرق دوستی اور احساسات اسلام پرستی کی اہل ایشا کے جہوں میں

روح پھوٹی ہے، یہ سب ملک ہند کے فرزندوں کی ہمت اور مجاہدائی
نہنے ہیں۔

جس زمانہ میں افغانستان کے علم دوست اور ادب پرور بادشاہ
یعنی غزنوی اور غوری اس کھسار سے رخت سفر باندھ کر علوم و ادبیات کو
ہمارے ملک میں یتیم چھوڑ گئے، تو اس وقت صرف ہندوستان ہی کی استعداد
قوم تھی جس نے ہماری سرزمین کے شعراء و فضلا کے قیمتی آثار اور گراں بہا
جواہرات کو آج تک کے لئے محفوظ کر دیا آج ہم دیکھتے ہیں کہ اقلیم ایشیا میں
بلخ و غزنی کے شعراء و فضلا کے قدردان، مشاہیر افغانستان کے قیمت
شناس اور اکابر ایشیاء اسلام کے نام و آثار کو تازہ کرنے والے زیادہ
تر ہندوستان ہی کے بزرگ اور حق شناس افراد ہیں۔

آج جبکہ جناب باری کی بے انتہا رحمت کے فیض سے ہمارا
افغانستان سخت خونیں اور ہولناک بھڑور سے نجات پا کر ایک علم دوست
اور ادب پرور فرزند یعنی اعلیٰ حضرت مجدد اور شاہ غازی مجدد شرف
تاریخ افغانستان قدیم کے لائق ہاتھوں میں پہنچ گیا ہے، اور اس شہریار بزرگ کی
کوششوں کے سایہ میں اپنے علم و ادب اور تاریخ کی تجدید کرنا چاہتا ہے
ہم دیکھ رہے ہیں کہ زیادہ تر ہمدردی اور پذیرائی فضلائے ہند کی طرف
سے ہو رہی ہے یعنی ہندوستان کی شریف قوم کا شریف احساس و
ادراک اسلام و ایشیا کے متعلق تمام مفید مقاصد کا زیادہ اہمیت کے ساتھ
اندازہ لگا رہا ہے۔

ہندوستان، ایران اور افغانستان جو ادبیاتِ فارسی کا وطن اور شعرائے عظام و عالی خیال کے ملک ہیں آپس میں ایک دوسرے کے اکابر اور شعراء کو بہت محبوب نظروں سے دیکھتے ہیں، اور اس پر دنیا کے سامنے تو اُم فخر کرتے ہیں۔

آخر میں ہم کہتے ہیں۔ اے محترم فاضلو! نہ تنہا ملک ہندوستان بلکہ سارا ایشیا آپ کا معنوی وطن ہے اور آپ کی بلند تمنائیں اور ارادے (جو آپ رکھتے ہیں) اور آپ کے مقصود کا ہدف خاکِ مشرق ہے! تمام اہل ایشیا خاص کر ہمارا افغانستان آپ کی بڑی امیدوں یعنی مشرق کی عظمت کی راویں خدا سے توفیق کی آرزو کرتا ہے ضمناً ہم کہتے ہیں کہ اگرچہ افغانستان کا کوہستان یورپ کے تکلفات سے خالی ہے اور اس سرزمین نے اب تک مادی پر تکلف مسرت کا کوئی موقع نہیں پایا ہے اس لئے ممکن ہے کہ بیرونی ممالک کے خوش گذریہاں کے سفر اور سیاحت کو پسند نہ کریں، لیکن ہم کو یقین ہے کہ اگر بابِ علم خوب جانتے ہیں کہ یہ سرزمین سلطان محمود غزنوی کا وطن ہے، غریبوں اور ابدالیوں کا مرز بوم ہے، ابن سینا کے سنائی غزنوی، عنصری، عجمی، قسقی، فاریابی اور آخر میں سید جمال الدین افغانی کا مسقط الراس ہے یقیناً سب جانتے ہیں کہ کشور افغانستان اس قوم کا جائے پناہ ہے جس کے افراد عموماً اسلامیت اور ایشیائیت کے مخلص دوست تھے اور ایک شریف بادشاہ اعلیٰ حضرت محمد نادر شاہ غازی کا پایتخت ہے جو دنیا کے اسلام و ایشیا کی عزت و بلندی کے تنہا خواہ ہیں آخر میں

۱۷
ہم عرض کرتے ہیں کہ یہ جلسہ جو آپ کے اعزاز میں منعقد ہوا ہے ایک نمونہ ہے افغانستان کی قوم اور حکومت کے ادبا و فضلا کے اظہارِ جذبات و احساسات کا اور ہم کو آرزو ہے کہ آپ حضرات اپنے پیارے وطن میں اس ہدیہ کے نمائندے بنیں گے جس سے مراد ہماری خالص محبت و اخلاص ہے اور ہمارے مغرور ہندوستانی بھائیوں کو عام طور پر ہمارا اسلام اور دوستانہ احترام پہنچائیں گے اور ہمارے ان دلی اور معنوی تعلقات کا ان سے تذکرہ کریں گے جو ساہا سال سے ہمارے دل کے اندر ہندوستان کی محترم قوم کی نسبت موجود ہیں۔

خاتمہ میں اس زحمت کو قبول کر کے جو آپ حضرات نے ہم کو عزت بخشی اور ہماری انجمن کی دعوت کو قبول فرمایا اس کے ہم بہت ممنون اور مشکربوئے ہوئے آپ حضرات اور ہندوستان کی بزرگ قوم کی سعادت اور توفیق مافی کے خدا سے آرزو مند ہیں آخر میں ہم کہتے ہیں مشرقی و عالم شرق! مسعود باد عالم اسلام!

اس کے بعد افغانستان کے مشہور شاعر جناب قاری عبداللہ خان صاحب کی حسب ذیل نظم ”خیر مقدم“ کے عنوان سے پڑھ کر سائی گئی۔

غزیاں ز ہندوستان آمدند	در افغانستان مہاں آمدند
در آناں یکے دکتر اقبال مند	سخن پرورد واقع از مال ہند
ادیب سخن گستر نکتہ سنج	کہ ہر نکتہ اش بہتر آمد ز گنج
چمن گروہ طرز رنگین دوست	شکر پارہ جوف شیرین دوست

کلامش چو اوج بلندی گرفت
 زند طعن آهنگ او برق را
 نویں شیوه را به بک کهن
 چون اندر سخن جاوۀ نو گزید
 سخن را در آیهخت چون با علما
 چو فکرش پیے فیلسوفی گرفت
 نوایش هم آهنگ با نفع صو
 جو بلبل با هنگ کبصار ما
 دیگر آنکه او نامور سید است
 هنرمند سر را سحر و نام
 روان هنرمندی و جان علم
 بعالم گر آن مکتب آوازیافت
 رئیس دبستان در آن مرز و بوم
 سوم سید ماکه از ندو است
 ز فیض و ش آزه شد جان علم
 چه کلکش معنی طرا زنده شد
 چه در شاهراه حقایق شتافت
 مضامین او جمله محکم بود
 دیگر مرد داناے ابدی حسن

سخن رتبه ارجمندی گرفت
 که خواهاں بود نهضت شرق را
 در آیهخت از قدرت علم و فن
 پیامی از مشرق میغرب رسید
 از وزنده شد طریز مولاے روم
 طرا ز سخن طریز صوفی گرفت
 که افسردگان را در آرد بشو
 ز هند آمد این طوطی خوشنوا
 گزین بخت آبل سر سید است
 کرد و مکتب هند دار و نظام
 علیگر چه بروز و دبستان علم
 ز جہدے ایں قدر انداز یافت
 شناسے قابل بطریز علوم
 زدانش بهندوستان قدو است
 در اقلیم دانش سلیمان علم
 خیالات شبلی از وزنده شد
 معارف از و رونق تازه یافت
 بکارش بکلکش مستم بود
 پر و فیسرے واقف از علم و فن

با انگلیسی و فرس عالم بود زبانِ درسی را معلم بود
 اویس سخن پرورِ فارسی سخنہائے او گو ہر فارسی
 بلفظِ درسی چون تکلم کند ز شوقش شکر دست و پا گم کند
 سخنہاش و لکش بیا نش ملیح چو ایرانیان لہجہ او فصیح
 ز بہرِ سیاحت دریں بوم و بید کشیدند از ہند رختِ سفر
 زرہ این عزیزان رسید خوش بکابل کنوں آرمیدند خوش
 درودِ مشاہیر ہندی نثار د بود رابطہ افزایِ متباد
 ازیں آمدن چوں گل گل شکفت بصد خرمی خیر مقدم بگفت
 غنیمت بود دیدنِ دوستان چو در فصلِ گل جلوہ بوستان
 مسلمان ز ہر جا بہم دوست بہ چو بادام توأم بیک پست بہ
 بہمسایہ ہمسایہ گروا رسد برش بہرہ دین و دنیا رسد
 کہ از دید و وادید زاید و داد ز ہم نگسند رشتہ اتحاد
 دلِ صاف احباب خرم بود چو در بین ہم رشتہ تکلم بود

خوش است اے عزیزان نہم پرں جوے
 کہ آید مگر آبِ رفته بہ جوے

اس نظم کے بعد مہمانوں کی طرف سے پروفیسر اویس نے ایرانی فارسی
 زبان میں ایک مفید تقریر کی جس میں نوجوان افغانوں کو شعر و سخن کے بجائے مغربی
 علوم و فنون کی تحصیل کی ترغیب دی گئی تھی ان کے بیٹھنے کے بعد سید اس مسعود
 صاحب نے حسب ذیل برجستہ تقریر کی۔

نواب مسعود جنگ ڈاکٹر تیدراس مسعود کی جوابی تقریر

محترم بزرگوار اور مہربان میزبانو! میں نہایت غلو سے خوشی کا اظہار اور شکریہ ادا کرتا ہوں اور اس توجہ کے شکریہ کے فرض سے جو آپ نے خاکسار کے حق میں فرمائی میں عہدہ برآ نہیں ہو سکتا، میں چاہتا ہوں کہ مسلمان ہند کے دلی جذبات و احساسات آپ تک پہنچاؤں ہمارے درمیان علامہ سید سلیمان ندوی علمائے ہند کے نمائندہ ہیں اور میرے معزز دوست علامہ اقبال اس گروہ کے نمائندے ہیں جس نے قدیم و جدید عناصر کو ملا کر ان سے ایک روح پرور معجون تیار کیا ہے، میں نہ تو علماء کی جماعت سے ہوں اور نہ شعراء کے فرقہ سے بلکہ میں نے اپنی تعلیم کا دور زیادہ تر یورپ کے ممالک میں ختم کیا ہے، لیکن میرا دل ان دونوں گروہوں کی عظمت و احترام سے سرشار اور لبریز ہے آپ کو میں یقین دلاتا ہوں کہ مسلمان ہند آپ حضرات سے غیر معمولی محبت اور تعلق رکھتے ہیں اور ہماری دنی آرزو یہی ہے کہ پیارے افغانستان کو مکمل امن و امان اور ترقی و آسائش کی حالت میں دیکھیں اور چونکہ افغانستان جغرافی نقطہ نظر سے ایشیا اور یورپ کے بیچ میں واقع ہے اس لئے ہماری خواہش ہے کہ افغانستان اسلامی تہذیب و اخلاق کا بہترین نمونہ ہونے کے ساتھ ٹھیک اسی وقت میں یورپ کے تمام مفید عناصر اور زیبا کیوں کا جامع ہو ہر چند کہ میں آپ حضرات کے عنایات کا بے حد ممنون ہوں لیکن میرے دل پر اس غیر معمولی

شخصیت کا جو خوش قسمتی سے اس وقت آپ کا بادشاہ ہے ایسا اثر پڑا ہے کہ میں اس کو بیان نہیں کر سکتا میں وہ وقت کبھی نہ بھولوں گا جب خوش قسمتی سے میری رسانی اعلیٰ حضرت کی خدمت میں ہوئی تھی یقین ہے کہ جو سلطنت آپ کا جیسا ملت دوست بادشاہ کھنٹی ہوئی تھی وہ سلطنت ترقی کے مدارج پر پہنچے گی اب یہ آپ کا فرض ہے کہ ہم تنہا ممکن ذریعہ سے ان کی خدمت اور اطاعت پر آمادہ رہیں اور اس بادریغ کے لیے اگر مجھ جیسا ناکارہ تعلیمات کے سلسلہ میں آپ کی کوئی خدمت کر سکتا ہے تو ان خدمات کے انجام دینے کے لیے میں ہر وقت حاضر و آمادہ رہوں گا لیکن ایک بات کہے بغیر میں آگے نہیں بڑھ سکتا سلطنت افغانستان کے جوانوں کو چاہئے کہ سفید بال والوں کی عزت و احترام کا ہر وقت خیال رکھیں ایسا نہ ہو کہ اختلاف رائے سے ان کی قومی وحدت میں رخنہ پیدا ہو جائے تاریخ شہادت دیتی ہے کہ مسلمانوں کے تمام نقصانات آپس کے نفاق اور تفرقہ کا نتیجہ رہے ہیں پس گزشتہ سے عبرت پکڑ کر اب اتحاد و اتفاق کو اپنے مقاصد قومی کام کرنا بنائے۔ آخر میں دوبارہ آپ کے پر خلوص عنایات کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور میں کبھی آپ کی مخلصانہ مہربانیوں کو فراموش نہ کروں گا۔

سید اس مسعود صاحب کی تقریر کے بعد جو بہت دلچسپی کے ساتھ سنی گئی تھی کسی مزید تقریر کی ضرورت نہ تھی لیکن حاضرین کے اصرار سے مجھے بھی مجلس ادبی کی مناسبت سے کچھ عرض کرنا پڑا۔

سید سلیمان ندوی کی جوابی تقریر

برادرانِ ہمدین و ہموطن و عزیزانِ علم و فن! آج ہم بہرہ —
خوش نصیب ہیں جو اس مجمع میں اپنے کو آپ حضرات کے ساتھ دیکھ رہے ہیں
چند خادمانِ علم و ادب کو اعلیٰ حضرت غازی کا یہاں بلانا، اور پھر
ان کا اس ملک کے فضلا، و علما، کے ساتھ اس ادبی جلسہ میں جمع ہونا میرے
نزدیک ایک پر شوکت تاریخی دور کا آغاز ہے۔

برادرانِ گرامی! ہندوستان اور افغانستان دو جداگانہ سلطنتیں
نہ تھیں بلکہ ایک تھیں شاید ڈیڑھ دو سو برس کا عرصہ ہوا ہوگا جب ان
دونوں ملکوں میں تفرقہ پیدا ہوا یہ دونوں ملک قدیم بدھ دورِ حکومت
میں ایک رشتہ میں منسلک تھے جیسا کہ آپ کے ملک میں اس اتحاد کی
سنگی یادگاریں زمینوں کے اندر ہر قدم پر دستیاب ہوتی ہیں جو آپ کے
عجائب خانہ میں بھی موجود ہیں۔

آغازِ عہدِ اسلام تھا آپ ہی تھے جن کے ذریعے سے نہ صرف
مذہب بلکہ علم و فن بھی ہندوستان کے قلب میں داخل ہوئے ہیں سلطان
غزنی اور شاہانِ غوری یہاں رہتے تھے لیکن ان کی حکومت کا دائرہ
ہندوستان تک پھیلا ہوا تھا اسی طرح بابر کا خاندان ہندوستان میں
مقیم تھا لیکن اس کا دائرہ حکومت افغانستان تک تھا اور یہ دونوں حکومتیں
ایک شہنشاہی کے لئے ایسی تھیں جیسے ایک جسم میں دو ہاتھ ہوتے ہیں۔
آج ڈیڑھ سو سال کے بعد یہ پہلا موقع ہے کہ یہ دونوں ہاتھ اگر

خادسیا سی کے لئے نہیں تو استقامت و ادبی اور باہمی محبت کے استحکام
لئے پھر مخلصانہ بڑھ رہے ہیں۔

افغانی بھائیو! آپ کے بزرگوں نے ہندوستان میں صرف جسمانی
درمادی حکمرانی نہیں کی ہے بلکہ معنوی اور ذہنی حکومت بھی قائم کی ہے
فارسی زبان مدت تک ہندوستان کی ادبی اور علمی زبان رہی ہے
براب بھی ہے یہ زبان صرف آپ کے وسیلہ سے ہم تک پہنچی ہے آپ کے
لہجہ میں سے میرزا، ہردی جو آپ کے ہرات کے تھے ان کے رسائل
تصنیفات تین سو سال سے ہندوستان کی عربی درسگاہوں میں فلسفہ کے
باق کا انتہائی معیار ہیں۔

فارسی زبان کے مشہور اور بڑے شعراء جو اس ملک میں پیدا ہوئے
اس طرح جئے پیدائش کے لحاظ سے افغانستان کے کسی شہر کی طرف منسوب
ہیں اسی طرح سکونت یا دفن کے لحاظ سے ہندوستان کے کسی شہر سے نسبت
کھتے ہیں۔

کتنے شاعر ہیں جو غزنی، بلخ، بدخشاں یا آپ کے دوسرے شہروں
در علاقوں سے تھے اور لاہوری اور دہلوی مشہور ہوئے جس نے عونی کی
باب الالباب کا مطالعہ کیا ہے اس کو معلوم ہے کہ یہ شعراء ایک رشتہ
حدت میں اس طرح منسلک تھے کہ تاریخ بھی ان میں سے بعض کے لاہوری
در غزنوی ہونے کا فیصلہ مشکل سے کر سکتی ہے۔

یہ دونوں سلطنتیں باہم اس قدر مربوط تھیں کہ اگر کوئی فاضل یہاں

پیدا ہوتا تو اپنی عمر کا کچھ حصہ وہاں بسر کرتا تھا اور وہاں پیدا ہوتا تو کچھ عرصے کے لئے یہاں زندگی گزارتا تھا مثلاً مسعود سعد سلمان جو شعرا کے دوسرے طبقے سے ہے اس کو ہندی یا افغانستانی کہنا اور تیز کرنا سخت مشکل ہے۔

میں نے جلال آباد اور کابل کے باغات دیکھے پہاڑی چشموں، نہروں، فواروں، آبشاروں کا نظارہ کیا جو اس سلطنت کی خاک کے ہر ذرہ سے نمایاں ہیں تو مجھے یقین ہوا کہ خاندان بابر نے کشمیر اور ہندوستان میں جو بکثرت باغ لگائے یا جگہ جگہ مصنوعی چشمے بنائے وہ سب افغانستان کے قدرتی مناظر کی نقل تھی۔

جلال آباد میں امیر شہید کے باغات کابل میں بابر کا باغ پغمان کے باغات نیز افغانستان کے دوسرے باغ لاہور کے شالامار سے کیسی قدرتی مشابہت رکھتے ہیں

اور مناظر فطرت کا یہ وطنی ذوق آلِ تیمور میں قدرتی طور پر ایسا موجود تھا کہ اس کو انھوں نے ہندوستان میں عملاً ظاہر کیا یہاں تک کہ دیوان عام اور خاص میں بھی گنگا اور جہنا گلکاری کے ذریعے سے دکھائی گئی ہیں۔

ہرادران علم و فن! جو کچھ پہلے ہو چکا کیا اب نہیں ہو سکتا؟ سیاسی تفرقہ دوری اور علمدگی کا ذکر چھوڑیے! یہ تغیرات عالم کی سرشت ہے گاہے چنیں گاہے چنناں! سیاسی حالات ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں اور سیاسی تعلقات ٹوٹتے اور جڑتے رہتے ہیں! لیکن علمی و ادبی تعلقات

دائم اور برقرار رہتے ہیں۔

سلطان محمود غزنوی کی تلوار عرصہ ہوا کہ ٹوٹ گئی اور اس کی فتوحات کے اوراق صدیاں ہوئیں کہ بکھر گئے لیکن حکیم سنائی غزنوی کا قلم اب تک باقی اور موجود ہے اور ان کی ادبی فتوحات کے اوراق کا شیرازہ اب تک منتشر نہیں ہوا ہے۔

آؤ سلطان محمود غزنوی، شہاب الدین غوری اور آل بابر نہیں بلکہ سنائی غزنوی، مسعود سعد سلمان لاہوری، خسرو دہلوی، حسن دہلوی فیضی اکبر آبادی اور بیدل عظیم آبادی کے نام سے ہم ایک دوسرے کی طرف مروت و محبت کا ہاتھ بڑھائیں۔

افغانستان نے ہمیشہ اپنے جسمانی زور اور مادی طاقت کے متعلق دنیا سے خراج تحسین وصول کیا ہے لیکن اب ضروری ہے کہ وہ اپنی دماغی طاقت اور ذہنی پہلوانی کا خراج بھی دنیا سے وصول کرے۔ آپ کی ادبی انجمن تحسین و ستائش کی مستحق ہے کہ اس نے اس آستہ میں قدم اٹھایا ہے اور ہر مہینہ میں اپنی طاقت اور زور کا نہایت خوبی کے ساتھ مظاہرہ کرتی ہے۔

میں بلا خوف تردید کہہ سکتا ہوں کہ رسالہ کابل، ہندوستان بلکہ ایشیا کے بہترین علمی رسالوں کے دوش بدوش جا رہا ہے اور اس سرت انگیز دور کے ظہور میں اس کا ہاتھ سب سے زیادہ کار فرما ہے۔

پڑوسی بھائیو! کیا یہ تعجب کا مقام نہیں ہے کہ ہم انگلستان، فرانس

اور جرمنی کے ایک ایک شاعر اور ادیب سے واقف ہوں اور ان کے شاہکاروں پر سر دھنیں لیکن ان دو ہمسایہ ملکوں کے ادباء اور اہل قلم آپس میں ایک دوسرے سے نا آشنا اور اجنبی رہیں حالانکہ ان دونوں کے قدیم بزرگوں کے درمیان نہ صرف وطنی تعلقات تھے بلکہ شاید مذہبی اور نسلی اتحاد بھی موجود تھا۔

لیکن اس سے زیادہ یہ کہ ان کے درمیان ایک ناقابل شکست علمی و ادبی اتحاد تھا اور کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ دو صدیوں سے ہمارے درمیان اس قدر بعد اور دوری ہو گئی ہے کہ نہ ہم آپ کے شعراء اور ادیبوں سے واقف ہیں اور نہ آپ ہمارے۔

ہم کو انجمن ادبی کے رسالہ کابل کا ممنون ہونا چاہئے جس نے یہاں کے لائق اہل قلم اور شعراء و ادباء سے ہمارا تعارف کرایا اور ہم نے باہم ایک دوسرے کو پہچانا ہے

برادران علمی و فنی! اہل سیاست کو ان کی شعبہ بازیوں میں مصروف رہنے دیجئے اور آئئے کہ ہم علم و فن کے نام سے پیمانہ محبت و دوستی کو تازہ اور عہد رفاقت و آشنائی کو مستحکم کریں، اور ہم دونوں اپنے اپنے وطن کے اندر یہ کر علم و ادب کے ایک جدید مشرق کی تعمیر و دوش بدوش کام کریں دونوں کا اتحاد جس طرح کا بھی ہو بگمائیوں اور غلط فہمیوں کو دور کر دیتا ہے۔

ہندوستان اپنے نوجوانوں کے ذریعہ سے اپنی تعمیر میں مصروف ہے

اور افغانستان بھی لہذا یہ ضروری ہے کہ اس تعمیر میں دونوں ملکوں میں سے ہر ایک کے نوجوان دوسرے ملک کے نوجوانوں کے ساتھ حسن ظن اور حسن اعتماد رکھیں! اگرچہ اس اتحاد کی راہ میں بہت سے مشکلات پیش آتے ہیں لیکن اس مقصد عزیزی کے حاصل کرنے کے لئے ہم کو سیکڑوں طرح کے مشکلات کا مقابلہ کرنا چاہئے ع

بہر ایک گل زحمت صد خار می باید کشید

وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمین۔

میرے بعد ڈاکٹر اقبال کھڑے ہوئے اور اپنے فلسفیانہ انداز بیان میں حسب ذیل تقریر ارشاد کی جو اس موقع پر بہت پر اثر ثابت ہوئی۔

ڈاکٹر سر شیخ محمد اقبال کی تقریر

سید سلیمان عاصب ندوی اور ڈاکٹر سر اس مسعود کی تقریروں کے بعد جن میں ہمارے جذبات کی نہایت خوبی سے ترجمانی کی گئی ہے اب کوئی چیز ایسی باقی نہیں ہے جس کو میں بیان کروں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ انجمن ادبی کابل کے ارکان مجھے بھی یہ توقع رکھتے ہوں گے کہ خیر مقدم خوش آمدید انھوں نے جس لطیف اور بلیغ ترین انداز میں کیا اور کہا ہے۔ اس کے جواب میں میں بھی کچھ عرض کروں میں انجمن ادبی کابل کا بہت ممنون ہوں کہ اُس نے اپنی مہربانی سے میرے متعلق نظم و نثر میں اچھے خیالات اور پرا حساس جذبات ظاہر کئے ہیں۔

میں بھی خواہش رکھتا ہوں کہ صرف اور صرف انجمن ادبی کابل کے

نوجوان ارکان کے عملی پہلو (فعالیت) اور کارروائیوں سے بحث کروں، کوئی شک نہیں کہ انجمن اپنے کام کی اہمیت اور ذمہ داری سے بخوبی آگاہ ہے، میرا یہ عقیدہ ہے کہ آرٹ یعنی ادبیات یا مصوری یا موسیقی اور یا سنماری جو بھی ہو ہر ایک زندگی کی معاون اور خدمتگار ہے اور اسی بنا پر آرٹ کو چاہئے کہ میں ایجاد کہوں نہ تفریح، شاعر ایک قوم کی زندگی کی بنیاد کو آباد یا برباد کر سکتا ہے، اس وقت جب حکومت کو شش کر رہی ہے کہ موجودہ زمانہ میں افغانستان کی تاریخ نئی زندگی کے میدان میں داخل ہو تو اس ملک کے شعراء پر لازم ہے کہ اخلاف نوجوان کے لئے سچے رہنما بنیں، زندگی کی عظمت و بزرگی کے بجائے موت کو زیادہ بڑھا کر نہ دکھائیں کیونکہ ”آرٹ“ جب موت کا نقشہ کھینچتا ہے اور اس کو بڑھا کر دکھاتا ہے اس وقت وہ ”سخت خوفناک اور برباد کن“ ہو جاتا ہے، اور جو حسنِ قوت سے خالی ہو وہ محض ایک پیغامِ موت ہے۔

دلبری بے قاہری جادو گر کی ہست دلبری با قاہری پیغمبر کی ہست
میں چاہتا ہوں کہ آپ کی توجہ کو ایک مرکزی نقطہ کی طرف مبذول
کراؤں حیاتِ نبوی صلعم کے واقعات میں سے ایک واقعہ ہے، روایت ہے
کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلعم کے حضور میں امرؤ القیس کے جو مشہور عربی شاعر
ہے کچھ اشعار پڑھے گئے، ارشاد ہوا۔ اشعر الشعراء وفائدہ ہرالی النار
ترجمہ تمام شاعروں میں بہتر شاعر اور ان کو دوزخ کی طرف لے جانے والا۔

اس ارشادِ سر اسرار سے واضح طور پر روشن ہوتا ہے کہ شعر کا مال

بعض اوقات لوگوں پر برا اثر ڈالتا ہے، ایک قوم کی زندگی کی موقوف علیہ چیزیں محض شکل و صورت نہیں بلکہ جو چیز حقیقتہً قوم کی زندگی کے ساتھ تعلق رکھتی ہے وہ ”وہ تخیل“ ہے جس کو شاعر قوم کے سامنے پیش کرتا ہے اور وہ بلند نظریات ہیں جن کو وہ اپنی قوم میں پیدا کرنا چاہتا ہے قومیں شعراء کی دستگیری سے پیدا ہوتی ہیں اور اہل سیاست کی پامروں سے نشوونما پا کر مرجاتی ہیں۔ پس یہ خواہش ہے کہ نوجوان افغانستان کے شعراء وانشا پرداز ہم عصروں میں ایسی روح پھونکیں جس سے وہ رفتہ رفتہ اخیر میں اپنے کو پہچان سکیں جو قوم ترقی کے راستہ پر چل رہی ہے اس کی ”نیت“ خاص تربیت کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے مگر وہ تربیت جس کا خمیر احتیاط کے ساتھ اٹھایا جائے پس انجمن کا کام یہ ہے کہ نوجوان نسلوں کی فکروں کو ادبیات کے ذریعہ سے تشکل کرے اور ان کو ایسی روحانی صحت بخشنے کہ وہ بالآخر اپنی ”انانیت“ کو پاکر اور قابلیت بہم پہنچا کر بچار اٹھیں۔

دوستہ تیغ و گردوں برہنہ ساخت
من آں جهان خیالم کہ فطرتہ ازلی
فناں کشید و بروی زمانہ آخت مرا
جہان بلبل و گل را شکست سافت مرا
نفس بہ سینہ گدازم کہ طائرہ حرّم
تواں ز گری آواز من شناخت مرا
میں ایک اور نکتہ بھی کہنا اور گزر جانا چاہتا ہوں موسیو یعنی نے
ایک اچھا نظریہ قائم کیا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ انہی کو چاہئے کہ اپنی
نجات حاصل کرنے کے لئے ایک کروڑ پتی کو پیدا کرے جو انہی کے گریبان
اینگلو سکس اقوام کے قرضہ جات کے چنگل سے چھڑا سکے یا کسی دوسرے

دانتے کو پیدا کرے جو نئی جنت پیش کرے یا کسی نئے کو مہیں کو حاصل کرے جو ایک نئے براعظم کا پتہ چلائے اگر آپ مجھ سے افغانستان کی نجات کے متعلق سوال کریں تو میں کہوں گا کہ افغانستان کو ایک ایسے مرد کی ضرورت ہے جو اس ملک کو اس کی قبائلی زندگی سے نکال کر وحشت ملی کی زندگی سے آشنا کرے لیکن مجھے خوشی ہے کہ افغانستان کو ایک ایسا مرد مل گیا ہے جس کا وہ عرصہ سے انتظار کر رہا تھا مجھے یقین ہے کہ اعلیٰ حضرت نادر شاہ کی شخصیت ایجاد کار کو اسی لئے پیدا کیا گیا ہے کہ افغانستان کا ایشیا میں ایک نئی قوم بنا کر دنیا سے تعارف کرائیں اس وطن کے نوجوانوں کو چاہئے کہ اس بزرگ رہنما کو اپنی تعلیم و تربیت کا معلم سمجھیں کیونکہ ان کی تمام زندگی ایثار اخلاص اور اپنے ملک کے ساتھ صداقت اور اسلام کے ساتھ عشق و محبت سے بھرپور ہے۔

ان تقریروں کے بعد لوگ کھانے کے لئے اٹھ کھانے سے پہلے ہاتھ دھونے کا سامان یعنی آفتابہ اور سلفی موجود تھا کھانے کا اہتمام ہوئی کے وسطی کمرہ میں تھا چاروں طرف پورے حلقہ میں بصورت دائرہ میز چچی تھی اور اس کی چاروں طرف کرسیاں لگی تھیں پورا دائرہ جہانوں سے بھرا تھا میرا اندازہ ہے کہ پچاس ساٹھ آدمی دعوت میں شریک ہونگے کھانے سب ہندوستانی طرز کے مطابق پہلے ہی سے دسترخوان پر لگا دیئے گئے تھے کھانے میں مختلف اقسام کے گوشت، کباب، مرغ اور مختلف انواع کے پلاؤ اور بعض یورپین مذاق کی چیزیں تھیں کھانے میں خاص افغانستان کی

کوئی ممتاز چیز نہیں معلوم ہوتی تھی اور ہم کو ان میں اور ہندوستان کے دسترخوان اور ان نعمت میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوا۔

میرے پاس ایک پیر کہن سال افغان بزرگ تھے جو ہندوستان میں ساہا سال رہ چکے تھے، سرسید احمد خاں مرحوم سے ملے تھے، اور حکیم اجمل خاں مرحوم سے بھی ان کی محبت اور دوستی تھی اردو اچھی بولتے تھے اور بایں ہمہ سن و سال ضعف قویٰ اور ضعف اشتہا کا کوئی علی گلمہ ان کو نہ تھا۔

کھانے کے بعد پھر پہلے کمرہ میں آکر لوگ بیٹھے اور اب مجلس پہلے کی طرح باقاعدہ نہ تھی میں وسط مجلس میں ایک اور جگہ جا کر بیٹھا جہاں ایک مصری فاضل زیدان بدران (رکن دائرہ تعلیم و تربیت دارالتألیف) نامی اور ایک بخاری فاضل جو عربی کے شاعر و ادیب تھے بیٹھے تھے ان سے دیر تک عربی میں گفتگو ہوتی رہی بخاری فاضل بالشوکی حکومت سے بھاگ کر یہاں پناہ گزین تھے اپنے ملک کے دردناک قصے سناتے تھے اور کہتے تھے کہ عنقریب ہندوستان آکر ملیں گے موصوف کی تعلیم شام میں ہوئی تھی۔

جس طرح ہندوستان میں پان یا لالچی کھاتے ہیں یہاں بادام اور پستے بھنے ہوئے تشریوں میں رکھے ہوتے ہیں جن کو لوگ شغل اور تفکد کے لئے کھاتے رہتے ہیں، یہاں پان کا وجود نہیں ہے حقہ بھی ہم نے نہیں دیکھا، البتہ نئے لوگوں میں سگریٹ اور سگار کا رواج خاصہ ہے ڈاکٹر

اقبال صاحب کا دلپسند مشغلہ حقہ ہے ان کا حقہ بھی ان کا رفیق سفر تھا چائے کے متعلق یہاں رواج یہ ہے کہ پہلی پیالی تو بیٹھی ہوتی ہے پھر دوسری پیالیاں بے شکر کے تلخ پی جاتی ہیں؟

ہمانوں میں ایک شنواری مولوی صاحب بھی تھے دہلی اور دیوبند میں تعلیم پائی تھی کہتے تھے کہ شاہ امان اللہ خاں نے اپنے اصلاحات کی نسبت مجھ سے فتویٰ پوچھا تھا تو میں نے ”دین و دولت“ دونوں کے فائدوں کو پیش نظر رکھ کر ان کے متعلق اپنی رائے لکھی اور ہر مسئلہ کے سامنے اس کا جواب لکھ کر ان کی خدمت میں پیش کیا شاہ مدوح اس کو پڑھ کر نہایت برہم ہوئے اور مجھے نظر بند کر دیا۔

یہ مجلس دس بجے تک قائم رہی جس کے بعد سب لوگ ایک دوسرے سے مل کر رخصت ہوئے ہم لوگ بھی اپنے قیام گاہ دارالامان میں واپس آئے رات آرام بسر کی سردی ہمارے صوبہ کے دسمبر کی راتوں سے زیادہ نہ تھی پٹنگ پر جو کمبل لگے ہوئے تھے وہ کافی تھے۔

باغ بابر۔ آج اکتوبر کی ۹ امرتایہ تھی سرور خاں سے ملے تھے کہ آج کابل کے بعض قابل دید مقامات کی سیر ہوگی صبح کی چائے اور ناشتہ سے فارغ ہو کر جو ہر شخص کو علیحدہ علیحدہ اس کے کمرہ میں پہنچا دیا جاتا تھا میں باہر نکلنے کے لئے تیار ہو گیا تھوڑی دیر میں سرور خاں آئے اور ان کے ساتھ سب سے پہلے ”باغ بابر“ گیا، یہ باغ موجودہ آبادی سے باہر ایک پہاڑ کے دامن میں واقع ہے، دامن میں باغ اور فوارے ہیں، اور اس سے

دنپائی پر باغ کی عمارت ہے اور اس سے اوپر پہاڑی کے بالکل نیچے ایک احاطہ میں شہنشاہ بابر کا کھلا مزار اور باغ کے بیچ میں جو عمارت ہے سنا ہے کہ امیر عبدالرحمن خاں نے بنوائی ہے اس اوپنی عمارت اور زیرین باغ اور فواروں کو دیکھ کر شالامار باغ لاہور کا ایک چھوٹا سا منظر نظر کے سامنے آگیا۔

میرے کابل پہنچنے سے پہلے اسی باغ میں کابل کی بلدیہ (مینیسٹری) کی طرف سے ہمارے رفقاء کو گارڈن پارٹی دی گئی تھی لیکن چونکہ میں اس میں شریک نہ تھا اس لئے اس کی تفصیلات کی مجھے اطلاع نہیں۔

عمارت مذکور اور مزار کے بیچ میں ہندوستان کی مغل عمارتوں کے نمونہ کی ایک چھوٹی سی مسجد بنی ہوئی ہے یہ مسجد شاہ جہاں نے سلطنت میں بنوائی تھی مسجد کی بیرونی چھت کے سامنے کی بلندی پر بادشاہ مذکور کا تاریخی کتبہ مع سال بنا کندہ ہے مسجد سے اوپر بلندی پر بابر کے مزار کا احاطہ ہے اوپر پہاڑ سے سنگ ستانی چشمہ اترتا ہوا نیچے بہہ رہا ہے احاطہ کے اندر بے سقف کی خانی زمین ہے اس کے بیچ میں شہنشاہ بابر کا سا سنگی مزار ہے جن لوگوں نے بابر کے بیٹوں اور پوتوں کے مزارات دہلی آگرہ اور لاہور میں دیکھے ہیں وہ ان کے مورث اعظم کے اس سادہ بے گنبد و عمارت قبر کو دیکھ کر بے اختیار اشک عبرت بہائیں گے لیکن اتنی تسکین کیا کم ہے کہ بارہ ہزار کی جمعیت سے ۳۲ کروڑ کے ہندوستان کو فتح کرنے والا آج بھی اپنی قوم کے آزاد ملک کی آزاد سرزمین میں آرام کر رہا ہے اپنی ایک

خود مختار سلطنت کے بنا و تعمیر میں جو بارہ برس تک خشک پہاڑیوں سے سر ٹکراتا رہا وہ مرنے کے بعد بھی ایک پہاڑی ہی کے نیچے پتھروں کا مسند اور تکیہ لگائے محو خواب ہے۔

یہ مزار جہانگیر کے عہد تک کتبہ سے بھی خالی تھا جہانگیر نے سر حائے پتھر کا ایک کتبہ نصیب کرایا ہے جس پر حسب ذیل فارسی شعر منقوش ہیں۔

بادشاہ ہے کز جنبش تلمفتے نور الہ
آں ظہیر الدین محمد بود بابر بادشاہ

باشکوه و دولت اقبال عدل داد و
داشت از توفیق و فیض دفع و فیروز ساء

عالم اجسام را گرفت و شد روشن طاق
بہر فتح عالم ارواح چوں نور نگاہ

شد چو فردوس محل مکان فلان من تیغ جہت
گفتش فردوس دائم جائے بابر بادشاہ

بابر کے مزار کے ایک پہلو میں ذرا دور ہٹ کر ہندال مزار اور ہمایوں کے بھائی حکیم مزار کے مزارات ہیں ان کی قبروں پر بھی جہانگیر نے کتبے لگائے ہیں اور دوسرے پہلو پر دہلی کے عالمگیر ثانی کی دختر گوہر النساء بیگم کی قبر ہے، مزار کا کتبہ حسب ذیل ہے۔

”مرقد گوہر النساء بیگم بنت عالمگیر ثانی بتایخ ۲۰ شعبان ۱۰۳۷ھ“

معلوم نہیں یہ ”درکنون“ دہلی سے کابل کو کیونکر منتقل ہوا شہنشاہ بابر کے خاندان کا یہ گور غریباں دیکھ کر دل بید متاثر ہوا مغفرت کی دعا مانگ کر آنسوؤں کے دو پھول مرقد شاہی پر چڑھائے علیٰ غصرت نادر خان مرحوم نے اپنے زمانہ میں اس مزار کی درستی کرائی ہے اور اس پر نہایت عمدہ قیمتی پتھروں کے پھول لگائے ہیں۔

مزار سے باہر آکر خستہ سے گزرتے ہوئے نیچے اترے اور موڑنے
ب شہر خموشاں کے بجائے شہر آباداں کی طرف کوچ کیا۔

مکتب صنائع نفیسہ۔ افغانستان میں مکتب کا لفظ مدرسہ یا اسکول کے
معنوں میں بولا جاتا ہے مزار بار سے نکل کر ہم سب سے پہلے مکتب صنائع نفیسہ
میں پہنچے صنائع نفیسہ کے معنی فنون لطیفہ یا ”فائن آرٹس“ سمجھے اس مدرسہ
شاہ امان اللہ خاں نے قائم کیا تھا پتھر کی اچھی خاصی دو منزلہ عمارت ہے
سامنے لڑکوں کے کھیلنے کا میدان ہے یہ میدان احاطہ سے گھرا ہوا ہے
اور احاطہ ایک پھاٹک ملے بند ہے موڑ جیسے ہی پھاٹک پر آکر رکا
بعض اساتذہ نے جو میدان میں کھڑے تھے اور مدیر مکتب جناب
غلام محمد خاں صاحب نے پر تپاک استقبال کیا اور ایک ایک کلاس
میں لے جا کر پورے اسکول کی سیر کرائی کل پانچ سو لڑکے اس میں اس وقت
زیر تعلیم تھے اور فنون لطیفہ میں سے نقاشی، نجاری، قالین بانی، رنگبری
اور مصوری وغیرہ کے مختلف کلاس زیر تعلیم تھے نقاشی جس کو وہاں
رسمی کہتے ہیں اس کے معلم ایک ہندوستانی تھے، قالین بانی کے
اعلیٰ استاد ایرانی تھے اور نجاری کے اعلیٰ کلاس میں ایک جرمن تعلیم
دے رہا تھا میں نے ہر ایک کلاس میں جا کر لڑکوں کے کاموں کو دیکھا میں
لکھنؤ کا سرکاری آرٹس اسکول دیکھا ہے مجھے یہاں کے صنائع نفیسہ کا کام
وہاں سے بہتر نظر آیا جس درجہ میں بھی ہم لوگ پہنچتے اس میں ایک طالب علم
ایک خاص نعرہ خیر مقدم لگاتا تھا جس کو سننے کے ساتھ تمام طلبہ ادب سے سلام

کرتے تھے میں نے اس نعرہ کے غیر مفہوم لفظ کا مطلب پوچھا تو بتایا گیا کہ اس کے معنی خبردار اور ہوشیار کے ہیں۔

مصوری کے کلاس میں ایک بوڑھا پٹھان لڑکوں کے سامنے بلند کی پرچپ چاپ پڑا تھا اور سب طلبہ منہ پھیلے ہوئے ایک ایک ادا کی تصویر اتار رہے تھے۔

قالین بانی کے کلاس کو پورا دیکھا اون یہیں رنگا جاتا ہے اور یہیں اس کا سوت تیار ہوتا ہے اور پھر آخر تک اس کے پورے مراحل یہیں طے ہوتے ہیں یہ رنگ یورپین ساخت کے نہیں ہوتے بلکہ پرانے طرز پر ملکی نباتات سے رنگ کر اور ان کو گرم پانی میں جوش دے کر نہایت روشن چکدار پختہ رنگ اون تیار کرتے ہیں قالین بنتے ہوئے میں نے سب سے پہلے یہیں دیکھا چھوٹے بڑے قالینوں کے اندازہ سے چوکھٹے دیواروں لگے کھڑے تھے ان میں ادنیٰ دھاگے کے تانے اوپر سے نیچے کی طرف تانے ہوئے تھے پھر چنڈ لڑکے ایک ایک قالین کے چوکھٹے کے پاس بیٹھ کر اس کے تانے بھرنے میں مصروف تھے ہر قالین کے شروع کرنے سے پہلے اس قالین کا نقشہ اور ڈیزائن بنایا جاتا ہے یہ نقشہ پہلے تیار کر لیا جاتا ہے اس میں ہر رنگ کی جگہ اور مقدار اور پھولوں کی صورت اس طرح نقش کیا جاتی ہے جس طرح مصوری کا چارٹ یا نقشہ خطوط اور نقطوں کی صورت میں بنایا جاتا ہے استاد یا کسی مستعد لڑکے کے ہاتھ میں وہ نقشہ ہوتا ہے اور وہ ایک خاص زبان اور اصطلاح میں ہدایات پڑھتا جاتا ہے اور لڑکوں کے

ہاتھ ان کے مطابق مشین کی طرح اونی تاروں پر حرکت کرتے جاتے ہیں اور مختلف نقش و نگار ان کے ہاتھوں کے نیچے بنتے جاتے ہیں دریافت کرتے سے معلوم ہوا کہ یہ ترکی زبان کے الفاظ و اصطلاحات تھے یہاں کے بنے ہوئے قالین اپنی خوبی، رنگینی، خوشنمائی اور دیرپائی میں ایرانی اور ترکی قالینوں کا مقابلہ کرتے ہیں انوس ہے کہ یہ ابھی تک اتنے زیادہ نیا رہیں ہوتے جو بازاروں میں اور بیرونی ملکوں کے مارکٹ میں بھیجے جاتے بناری کے کارخانہ کو دیکھ کر جمی خوش ہو گیا، لکڑی اتنی اچھی جو میں نے ہندوستان میں نہیں دیکھی، نیکل کی لکڑی جو بیٹی اور برما میں سب سے بہتر سمجھی جاتی ہے اس سے وہاں کی لکڑی بہتر تھی یعنی پختہ دزنی اور آہنی پکینی کہ چیرنے کے بعد رندے اور خراد کے بغیر وہ رندمی اور خرا دی ہوئی معلوم ہوتی تھی لکڑی کے گود میں ایسی خوشنما لکیریں کہ وہ بجائے خود نقش معلوم ہوتی تھیں اس صیغہ میں لکڑی چیرنا کاٹنا، پھیلنا، لکڑے کرنا اور ٹکڑوں کو جوڑنا تو معمولی کام تھے آخری کام فرنیچروں کے نقشے اور ڈیزائن تیار کرنے اور ان کے مطابق عمدہ فرنیچروں کی ساخت ہے اس آخری کلاس کا معلم ایک جرمن تھا حکومت کا اثر یہ ہے کہ جب میں نے اس کے کلاس کے اندر قدم رکھا اس نے السلام علیکم کہہ کر استقبال کیا۔

صنائع نفیسہ کے اکثر کلاسوں کو دیکھ کر باہر نکلا تو میدان میں اس عظیم الشان اضافہ کو دکھایا گیا جو موجودہ حکومت اس مدرسہ کی عمارات میں کر رہی ہے یہ عمارات زیر تعمیر معلوم ہوتی تھیں جب کبھی وہ مکمل ہو جائیں گی تو

اس مدرسہ کی ظاہری حیثیت بھی بہت بلند ہو جائے گی اور مدرسہ بہت وسیع ہو جائے گا۔

سرکاری موٹر خانہ - یہاں سے واپسی میں موٹر خراب ہو گئی تو فراس کو لے کر سرکاری موٹر خانہ میں گیا یہ ایک چھوٹی سی عمارت ہے جس میں بہت سب سے گیرج بنے ہوئے ہیں یہاں خراب موٹروں کی مرمت کی جاتی ہے افسر موٹر خانہ بڑی توجہ اور انتظامات سے پیش آیا سرور خاں کے کہنے سے اس نے خراب موٹر کو مرمت کے لئے لے لیا اور دو سرائعہ موٹر اس نے بدل کر دیا، موٹروں کی مرمت و اصلاح کا یہ کارخانہ بھی موجودہ حکومت کی پیداوار ہے نئی دکانوں کی عمارتیں - موٹر خانہ جاتے ہوئے راستہ میں دکانوں کی جدید عمارتوں کا ایک وسیع سلسلہ نظر آیا، یہ یورپ کی دکانوں کے طریق پر بنائی گئی ہیں باہر دروازوں میں پورے پورے شیشے لگے ہیں، تاکہ دکانوں کے بند ہونے کے باوجود اندر کی چیزیں شایقین کو نظر آ سکیں یہ عمارتیں بھی موجودہ حکومت نے دکانوں کے لئے بنوائی ہیں ابھی ان کی تعمیر پوری ختم نہیں ہوئی ہے یہ دکانیں جب آباد ہو جائیں گی تو کابل پر ممبئی یا کسی یورپین شہر کا دھوکہ ہوگا۔

ہوائی جہازوں کا میدان - ان دکانوں کے بالمقابل دوسری طرف ابھی کوئی جوابی لائن نہیں بنی ہے اسی کے سامنے ایک بہت بڑا میدان ہے جس کو برابر کر کے مسطح کیا گیا ہے اور اس کو ہوائی جہازوں کے اترنے اور اڑنے کے لئے مخصوص کیا گیا ہے۔

بالاحصار کا مکتب حربی۔ اس کے آگے بڑھ کر بالاحصار کی پہاڑی اور میدان آیا یہ مقام کابل کا سب سے بلند مقام ہے اس کے پاس ہی جھیل یا تالاب ساپانی پھیلا تھا یہ پہلے کابل کے امراء اور والیوں کا حاکم نشین قلعہ یہ قلعہ تاتاریوں کے حملہ کے وقت بھی موجود تھا مگر دراصل بابر نے اس کو مضبوط و مستحکم کیا تھا، ہمایوں نے اپنے بھائی پر جب حملہ کیا تھا تو وہ اس وقت اسی قلعہ میں تھا یہی وہ قلعہ تھا جس میں خرد سال اکبر کو ظالم چچا نے باپ کی توپوں کے گولوں کے رخ پر اس لئے بٹھادیا تھا کہ ہمایوں کی توپیں قلعہ پر گولے سر نہ کر سکیں اکبر نے تخت نشین ہو کر اس کو امر فرودست کیا جب جہانگیر تخت آرا ہوا تو اس نے کاشی کاری کے کاموں سے اس کو زینت دی شاہجہاں کے زمانہ میں علی مردان خاں حاکم کابل نے جوشا جہاں کا میر عمارت بھی رہ چکا تھا یہاں بہت سی نئی عمارتیں بنا کر کھڑی کیں اور کابل کا موجودہ مشہور چہار چہتہ بھی اسی کی تعمیر ہے اور اسی کے قریب رنگت نے مسجد گدری بنوائی۔

بہر حال اس وقت سے لے کر آج سے پچاس ساٹھ برس پیشتر تک قیام کابل کے امراء اور حکام اور سلاطین سدوزی کا دار الحکومت اور مقرو قیامگاہ رہا ۱۲۹۶ھ ہجری (۱۸۷۹ء) میں جب انگریزوں نے اپنے فتول سفیر کیونری کے انتقام میں کابل پر چڑھائی کی تو اس تاریخی قلعہ کو رو دنگا کر اس طرح اڑا دیا کہ وہ راکھ کا ڈھیر اور پتھروں کا انبار ہو کر رہ گیا اس وقت سے لے کر آج تک یہ مقام اسی طرح ویران پڑا تھا اور

محض عبرت گاہِ ایام تھا، سال گزشتہ اعلیٰ حضرت نادر خاں شہید مرحوم نے اس مقام کی تاریخی حیثیت کو دوبارہ زندہ کرنے کے لئے اس کو مکتبِ حبیبی (ملٹری کالج) قائم کرنے کے لئے موزوں سمجھا چنانچہ سال گزشتہ ۷ ابرہور کو اعلیٰ حضرت شاہ شہید نے خود اپنے ہاتھوں سے اس تاریخی مقام میں مکتبِ حبیبی کا سنگ بنیاد نصب کیا اور تمام حکام و اشراف و اربابِ مناسب اور پر جوش اہل شہر نے اپنے ہاتھوں میں کدالی اور پھاوڑے لے کر اس زمین کو ہموار و سطح کیا گویا یہ دن کابل کے قومی جوش و خروش کا سب سے بڑا تاریخی مظاہرہ تھا جس وقت میں اس میدان میں پہنچا میرے رفیق سرور خاں نے قومی افتخار کے ساتھ اس میدان کی طرف اشارہ کیا اور افغانوں کو چھ سو برس کے اُن روایات ملی کو جو اس مقام سے وابستہ ہیں، بیک جنبشِ نگاہ دہرا دیا ابھی تک مکتب کی عمارت کی طرح نہیں ڈالی گئی ہے اگر شاہ کی شہادت کا یہ غمناک حادثہ پیش نہ آیا ہوتا تو شاید تعمیر کا کام شروع ہو جاتا۔

دو صحابیوں کے مزار پر بالاحصار کی پہاڑی کے نیچے نیچے موڑنے حرکت شروع کی اور بالاحصار کے کھنڈر کی دوسری طرف پہنچ کر ایک ایسے مقام پہنچے جہاں شاید پہلے آبادی ہو مگر اس وقت وہ بے نشان ہے، اس سے آگے بڑھ کر ایک پرانے قبرستان کے پاس پہنچے جو پہاڑی کے دامن میں واقع ہے اس قبرستان میں ایک طرف مشہور ہے کہ دو صحابیوں کے مزار ہیں انفاق میں ان کے نام حضرت تیمم اور حضرت جبیر مشہور ہیں گو تاریخ سے ان بزرگوں

شخصیت کا ثبوت ہم پہنچا نادشوار ہے تاہم شہرت عام کی قطعی تکذیب بھی مشکل ہے بہر حال وہ صحابی ہو یا تابعی ہوں شاہ شہید کی حکومت نے عقیدت عام کی بنا پر ان دونوں بزرگوں کی قبروں کی مرمت کرائی ہے اور جس وقت میں پہنچا ہوں اس کے چاروں طرف عمارت کا کام جاری تھا اور معمار اس کے سامنے ایک فوارہ بنانے میں مصروف تھے وعاے سنون پڑھ کر یہاں سے واپس ہوا۔

سفراء کے مکانات - یہاں سے واپسی میں اس سڑک سے گزر ہوا بدھراکٹر دول خیر کے سفراء کے مکانات ہیں میرے رفیق نے بتایا کہ ملطینی اپنے ہاں افغانی سفراء سے مکانات کی نسبت جو بڑا دکر تے ہیں ہی ان کے سفراء کے ساتھ یہاں برتا جاتا ہے یعنی اگر وہ مکانات کے رائے لیتی ہیں تو افغانی حکومت بھی ان سے یہاں کرایہ لیتی ہے، ورجو افغانی سفروں کو بے کرایہ مکان دیتی ہیں تو ان کو بھی یہاں بے کرایہ مکان دیا جاتا ہے، چنانچہ جب ہم ایرانی سفیر کے قیام گاہ کے بچے سے گزرے تو بتایا گیا کہ ایرانی حکومت چونکہ افغانی سفیر سے مکان کا کرایہ نہیں لیتی تو یہاں بھی اس کے سفیر کو یہ مکان دوستانہ بے کرایہ دیا گیا ہے۔

امان اشرفاں کے زمانہ ہی سے انگریزی سفارت خانہ ایک مقام پر اٹھ گیا ہے، جو کوہ دامن اور مکتب حربی کے درمیان ہے نہیں کہا جاسکتا کہ وہ مقام دونوں سلطنتوں کے سیاسی مفاد کے

محاطے کہاں تک مناسب ہے۔

رموز مملکت خویش حسرواں داسد

دارالعلوم عربی۔ اب میں نے یہاں کے عربی مدرسہ کے دیکھنے کی خواہش کی جس کا نام ”دارالعلوم“ ہے یہ مدرسہ پرانے شہر کے اندر ایک گلی میں واقع ہے سڑک کی ایک گلی پر پہنچ کر موٹر رک گیا یہاں سے اتر کر گلی میں قدم رکھا تھوڑی دور چل کر ایک بڑے مکان کے اونچے دروازہ کے اوپر دارالعلوم عربی کا سائن بورڈ نظر آیا اندر سے عمارت خاصی بڑی تھی، دو منزلہ عمارت ہے اور دونوں میں مدرسہ کی جماعتیں مصروف درس تھیں رئیس مدرسہ کا نام قاری عبدالرسول خاں ہے اور مدرسین میں اکثر وہ افغانی علماء تھے جنہوں نے ہندوستان میں تعلیم پائی ہے مدین فارسی زبان میں تقریر کر رہے تھے طلبہ کے سروں پر سپید افغانی گول پگڑیاں اور جسم میں گرم یاروئی دارلبادے تھے ادب سے بیٹھے ہوئے استاد کی تقریریں سن رہے تھے۔

سب سے پہلے جس جماعت میں پہنچا اس میں مشکوٰۃ کا درس ہو رہا تھا اور مقام وہ تھا جہاں اوقات ثلثہ (زوال) طلوع اور غروب میں نماز پڑھنے کی مانعت آتی ہے پھر اس کے مقابل وہ حدیث تھی جس میں بیان ہے کہ اگر طلوع آفتاب سے پہلے ایک رکعت صبح کی ادا کر لی، غروب سے پہلے عصر کی ایک رکعت تمام کر لی ہے تو دونوں نمازیں مؤتمر ہو جائیں گی چونکہ امام ابوحنیفہ کا مسلک اس بارہ میں یہ ہے کہ عصر کی نماز تو ہو جائیگی

مگر صبح کی نہیں ہوگی اور اس لئے مدرس صاحب نے علماء احناف کے مشہور طریقہ استدلال کو کہ چونکہ یہ دونوں حدیثیں یعنی منع صلوٰۃ اور اس ایک رکعت کے پالینے پر پوری نائزیں درست ہو جانے والی حدیث میں تعارض ہوا تو ہم نے قیاس کی طرف رجوع کیا اور یہ فیصلہ کیا کہ چونکہ عصر کی نماز ناقص وقت میں شروع کی گئی اور ناقص وقت میں تمام ہوئی اس لئے درست ہوئی اور صبح کی نماز صحیح وقت میں شروع ہوئی اور ناقص میں تمام ہوئی اس لئے وہ درست نہیں ہوئی، میراجی چاہا کہ عرض کروں کہ ان دونوں حدیثوں میں تعارض سرے سے نہیں، حدیث منع کا منشا یہ ہے کہ عین زوال اور طلوع اور غروب کے وقت نماز شروع نہ کیجائے اور دوسری حدیث کا مفاد یہ ہے کہ اگر کسی نے طلوع یا غروب سے پہلے نماز شروع کی تھی کہ ایک رکعت بعد دوسری رکعت میں آفتاب طلوع یا غروب ہو گیا تو نماز توڑی نہ جائے تمام کی جائے اور وہ نائزیں درست ہوں گی لیکن افغان علماء کے تشدد کا خیال کر کے میں نے جرات نہ کی سرور خاں نے کہا بھی کہ یہ کچھ پوچھنا چاہتے ہیں، لیکن میں نے تردید کی کہ نہیں اس کی ضرورت نہیں۔

یہاں سے اُنھ کو اوپر کی منزل میں گیا وہاں ہدایہ کا درس جاری تھا وہاں بھی خاموش رہا اس کے مقابل کے دوسرے کمرے میں ہیئت قدیم میں شرح چمنی ہو رہی تھی سبق ختم ہوا تو مولانا نے خوش اخلاقی کی گستاخانہ کیا اور گفتگو کی اتنی نرمی پا کر میں نے عرض کیا کہ حضرت اب تو

آسمان ہی سرے سے مسلم نہیں اور آپ تو آسمانوں کی ترتیب پر استدلال قائم فرما رہے ہیں فرمایا کہ کیا کیا جملے یہاں جب تک ان علوم کو نہ پڑھیں ہم کو ملتا ہی تسلیم نہیں کیا جاتا۔

مدرسہ کے نصاب جاری کا نقشہ دیکھا وہی کتابیں تھیں جو ہندوستان کے قدیم عربی مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہیں طلبہ میں دو باتیں عجیب معلوم ہوئی ایک تو یہ کہ کوئی طالب علم بھی پچیس تیس چالیس برس سے کم کا نہیں معلوم ہوا سب کی اچھی خاصی بڑی دڑھیاں دوسرے یہ کہ ان طالب علموں میں تیزی اور ذہانت کا کوئی ثبوت نہیں ملا ہمارے ہاں کے عربی مدرسوں میں یوں بھی اگر کوئی باہر کا آدمی آجائے توجہ طالب علم اپنی ذہانت اور تیزی کی نمائش کے لئے استاد سے سوالات اور اعتراضات اور جوابات کی بڑی قوت دکھاتے ہیں افغان عربی طلبہ کی یہ سرطبعی حقیقت میں ان کی دماغی قوت کی کمزوری کے سبب سے نہیں ہے بلکہ طریقہ تعلیم کی کمزوری اور طرز تربیت کی خرابی سے ہے ورنہ وہی افغان طلبہ جس کے علوم پڑھتے ہیں تو ان کی فطری ذہانت اور تیزی آخر پوری طرح ظاہر ہوتی ہے۔

ضرورت ہے کہ اس مدرسہ کے نظام تعلیم میں اصلاح کی جائے اور اس کے نصاب میں نئے علوم کو داخل کیا جائے اور ضرورت کے مطابق ان طلبہ کے رہنے پسنے کے طور و طریق میں صفائی اور بلندی کا خیال رکھا جائے وہاں علمائے طبقہ کو ایسا سمجھا جاتا ہے کہ یہ یا تو شیشہ ہے کہ ذرا

ہاتھ لگایا اور ٹوٹا یا بارود ہے کہ اس میں بے احتیاطی سے ذرا گرمی پہنچی
 تو بھک سے اڑ جائے گا، اور زلزلہ پیدا کر دے گا یہ خطرہ ایک جد
 ات صحیح ہے لیکن اگر افغانستان کو زندہ رہنا ہے تو اس خطرہ سے ایک
 وچار ہونا لازمی ہے اور اس کی صحیح صورت یہ ہے کہ طریقہ تعلیم نظام
 تعلیم اور نصاب تعلیم میں رفتہ رفتہ اصلاح کی جائے اور ایسے علماء
 پیدا کئے جائیں جو نئی تعلیم کے نوجوان افغانوں کی رہبری کر سکیں اور
 مفید اصلاحات کی پیش رفت میں مدد دے سکیں مہمائے افغانستان نے
 زشتہ دور ہائے حکومت میں بڑے بڑے کام انجام دیئے ہیں کوئی
 جہ نہیں کہ آج پھر وہی کام وہ انجام نہ دے سکیں نظم و اصلاح دین
 انش اور علم و فن کے آج کتنے کام ہیں جو ان کی نگرانی و انتظام کے منتظر ہیں
 بدیدہ مدارس۔ اس عربی مدرسہ دارالعلوم کے علاوہ یہاں جدید
 تعلیم کی بھی چند درسگاہیں ہیں جن کے نام حسب ذیل ہیں۔
 مکتب حبیبیہ، مکتب نجات، مکتب استقلال، مکتب دارالمسلمین، مکتب غازی
 مکتب منافع نفیسہ، مکتب زراعت، مکتب طبی، دارالحفاظ، یتیم خانہ نادری
 مکتب دو اسازی، مکتب حربیہ، مکتب قابل یہ تو بڑے مدرسے ہیں
 ان کے علاوہ شہر میں تین ابتدائی مدرسے بھی ہیں
 افغانستان میں مکتب کا لفظ ہائی اسکول اور کالج کے لئے بولا جاتا
 ہے ہمارے ہندوستانی ناظرین ان مکتبوں سے اپنے ہاں کے بچوں کے
 متنب نہ سمجھیں۔

ان مکاتب میں سب سے پرانا مکتب حبیبیہ ہے جو امیر حبیب اللہ خاں کی یادگار ہے انھیں کے زمانے میں بنایا گیا تھا یہاں پہلے بھی اور اب بھی زیادہ تر ہندوستانی مسلمان معلم و مدرس ہیں انگریزی تعلیم ہوتی ہے، مکتب حبیبیہ یعنی فوجی کالج بھی یہاں پہلے سے ہے امیر امان اللہ خاں نے اپنے زمانہ میں ایک فرانسیسی اور دو سراجرمن زبان کے لئے دو اسکول قائم کئے تھے جن میں سے ایک کا نام آمانیہ اور دوسرے کا آمانی رکھا تھا مگر اب جرمن کالج کا نام مکتب نجات اور فرانسیسی کالج کا نام مکتب استقلال ہے، مکتب دارالمعلمین میں استاد تیار ہوتے ہیں مکتب صنائع نفیسہ کا ذکر پہلے گزر چکا ہے، مکتب زراعت کاشتکاری و باغبانی کی تعلیم کے لئے ہے کابل و پغمان کے بیچ میں اس کی عمارت ہے، مکتب طبی شاہ نادور خاں کے عہد کی یادگار ہے یہ دارالامان میں واقع ہے اور جس دارالفنون کابل یعنی کابل یونیورسٹی کا تخیل شاہ مرحوم کو تھا اس کا بنیاد اولین کے طور پر پہلے اسی طبی کالج کا شعبہ قائم کیا گیا ہے اور یہ کھل گیا ہے اور اس کا کام عہدگی سے جاری ہے اسی کے ساتھ دوا سازی کا بھی ایک مدرسہ کھول دیا گیا ہے تاکہ دوائیں خود افغانستان میں تیار ہو سکیں۔

دارالحفاظ میں صرف حفظ قرآن کے لئے لڑکے جاتے ہیں اور حافظ ہوتے ہیں یتیم خانہ خاص نادور خاں مرحوم کا قائم کیا ہوا ہے اس میں شہر کے یتیم بچے رہتے اور پڑھتے ہیں اور مکتب صنائع میں صنعت و حرفت سیکھتے ہیں مکتب مربیہ جس میں فوجی تعلیم ہوتی ہے بہت بڑے چمیانہ پر قائم ہے، ترک ایٹالوی، جاپانی اور جرمن استاد ہیں نادور خاں نے اپنے زمانہ میں کتب قابل

کے نام سے ایک اور جنگی اسکول قائم کیا تھا، اس میں سرحد کے بڑے بڑے سڑار ان قبائل کے بچوں کو مفت فوجی تعلیم دیتا تھا ہے، سرور خان نے مجھے بتایا کہ اس میں اس وقت تین سو بچے زیر تعلیم ہیں۔

مکتب نجات اور مکتب استقلال جن کے پہلے نام امانیہ و امانی ہیں، جرمن اور فرینچ تعلیم کے لئے مخصوص ہیں، استقلال سے مقصود اخیر جنگ انگریز و افغان کے بعد امان اللہ خاں کے زمانہ میں افغانستان کی خود مختاری ہے اور نجات سے مراد بچہ سقا کے فتنہ کا فرو ہونا ہے، ان دونوں مدرسوں کے یہ جدید نام افغانستان کے دو گزشتہ اہم واقعات کی یادگار ہیں۔

ملک افغانستان میں اب تک کوئی متحدہ نظام تعلیم جاری نہیں، بیسیہ نجات اور استقلال تین طرزوں کی تین مستقل درسگاہیں جن میں اول میں انگریزی، دوم میں جرمنی اور سوم میں فرینچ ذریعہ تعلیم ہے اور یہ قرار دیا گیا ہے کہ انگلستان فرینچ اور جرمنی ان تین ملکوں میں سے جس ملک میں جن فنون کی تعلیم بہتر ہوتی ہے، ان کے لئے یہاں انگریزی یا فرینچ یا جرمن کی تعلیم افغان بچوں کو دلا کر بعد کو ان فنون کی اعلیٰ تعلیم کے لئے ان کو انگلستان، فرانس اور جرمنی بھیجا جائے گا یا یہاں ان تینوں ملکوں کی ابتدائی تعلیم کے مدرسے ہیں اور ان کی تکمیل کی اصلی درسگاہیں انگلستان یا فرانس یا جرمنی ہیں۔

اس نظام تعلیم نے ملک میں بیداری پیدا کر دی ہے، ایک ایک

افغان بچہ کی تعلیم اور یورپ کی آمد رفت اور قیام اور تعلیم پر جو صرف آتا ہے اس سے افغانستان میں ایک چھوٹا موٹا مدرسہ چل سکتا ہے، علاوہ ازیں ملک کے اندر تین مستقل غیر ملکی زبانیں غیر ملکی معاشرتیں، غیر ملکی سیاستیں اور غیر ملکی ذہنیتیں جڑ پکڑ رہی ہیں، اور جن کا نقصان افغانستان کو آج نہیں تو کل اسی طرح معلوم ہوگا جس طرح ترکی کو گزشتہ جنگ عظیم میں معلوم ہو گیا یہی وہ خیالات ہیں جن کی بنیاد پر شاہ نادر خاں مرحوم کو خود کابل میں ایک افغان یونیورسٹی (دارالعلوم کابل) کے قیام کی ضرورت محسوس ہوئی۔

مدارس کے بعد موجودہ تمدن کا دو سر استون مطبع ہے سرکاری مطبع عمومی۔ دارالعلوم سے نکل کر یہاں کے مطبع عمومی کو دیکھنے گیا اگرچہ کابل میں مطبعوں کا رواج امیر شیر علی خاں کے زمانہ سے شروع ہو گیا تھا مگر اخباری و صحافتی حیثیت سے کابل میں اس صیغہ کی تکمیل امیر حبیب اللہ خاں کے زمانہ میں ہوئی اور سراج الاخبار کے لئے ایک اچھے مطبع کی ضرورت پیش آئی اور لیتھو کی جگہ ٹائپ کو دینی پڑی امیر امان اللہ خاں کے عہد میں مزید ترقی کے مواقع ملے اور مطبع عمومی کے نام سے ایک وسیع سرکاری مطبع وجود میں آیا، اور عجیب بات یہ ہے کہ اس پروگنڈے کے عہد میں افغانستان کے ہر گزشتہ انقلاب میں سلطنت کے دیگر کارخانوں میں جو اخراج تفری ہوئی ہو مگر اس کارخانہ اشاعت کی ضرورت سے کسی کو انکار نہیں ہوا امان اللہ خاں کے زمانہ میں یہاں سے

۱۰۳
 امان افغان نکلے تھا، بچہ سقا کے فتنہ میں یہاں سے حبیب الاخبار نکلا
 اور شاہ نادر خاں کے عہد میں اصلاح نکلنے لگا اور جواب تک اسی
 نام سے نکل رہا ہے۔

مطبع عمومی ارکب شاہی کے قریب بلکہ متصل واقع ہے، سڑک کے
 رخ دو عمارتیں ہیں اور ان دونوں کے بیچ میں ایک چوڑی سی گلی ہے
 موٹر سے سڑک پر اتر کر پہلے ایک عمارت میں داخل ہوا، یہ ایک وسیع
 ہال تھا جس میں ٹریڈل (پاؤں سے چلائے جانے والے ٹائپ کے پریس)
 اور دوسری بڑی بڑی مشینیں کام میں مصروف تھیں بجلی کی طاقت سے
 کام ہو رہا تھا میرا اندازہ ہے کہ آٹھ دس مشینیں کام کر رہی تھیں یہ تمام
 مشینیں نہایت عمدہ نہایت صاف اور بالکل جدید طرز کی تھیں، سرکاری
 اسٹامپ رجسٹروں کے کاغذ، ڈاک کے ٹکٹ اور دوسرے سرکاری کاموں
 کے علاوہ سرکاری کتابیں انجمن ادبی کے تصنیفات و رسائل اور روزانہ
 اخبار اصلاح وغیرہ سب اسی مطبع میں چھپتے ہیں۔

اس وقت پریس میں جو کام ہو رہا تھا وہ یہ تھا ایک پریس پریٹر
 کے اوراق دوسرے پر رسالہ کابل اور تیسرے پر قرآن پاک چھپ رہا
 تھا یہ قرآن پاک حکومت افغانستان کی طرف سے دہائی کی
 مجلس علماء کے زیر نگرانی نہایت اہتمام سے چھپ رہا ہے اس وقت تک
 اس کے دو پارے چھپے تھے۔

یہاں سے نکل کر مطبع کی دوسری عمارت میں گیا یہ مطبع کی صنعت
 نفع کا

۱۰۴
 شبہ تھا یہاں زنگو گرائی اور فوٹو گرائی اور فائن آرٹ کی اعلیٰ ترین اور نفیس ترین چھپائی کا کام ہو رہا تھا یہیں ایک کمرہ سیاہ پردوں کے غلاف میں فوٹو لینے کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ پھر اس کا بلاک بنانے اور اس کے چھاپنے کے آلات اور پریس تھے۔

یہاں کا عملہ زیادہ تر خود افغان کارکنوں پر مشتمل تھا افسر اعلیٰ صوفی عبدالحمید خاں ہیں جو باوجود نحیف و لاغر جسم ہونے کے اپنے فن میں کامل ہیں طباعت نفیسہ کے شعبہ میں ایک دو جرمین کام کرنے والے بھی نظر آئے زنگو گرائی کے استاد ایک ترک تھے۔

اس پریس میں مجھے تین خصوصیتیں نظر آئیں۔

۱۔ سامان سب اعلیٰ اور عمدہ اور جدید تھا

۲۔ کام کا نمونہ نہایت صاف ستھرا تھا۔

۳۔ پریس اور پریس کے تمام کام کرنے والے بلکہ پریس کی تمام

زمین و آسمان سب میں حد درجہ صفائی اور ستھرائی تھی کہیں داغ و صہبہ یا زمین پر کوڑا کرکٹ بلکہ ردی کاغذ تک پڑا نظر نہیں آتا تھا

صوفی صاحب نے فرمایا کہ مطبع کے لئے اعلیٰ حضرت نادر شاہ نے بہت سی نئی مشینیں جرمنی سے منگوائی ہیں جو عنقریب آنے والی ہیں ان کے آجانے کے بعد یہ مطبع قریباً دو ناہو جائے گا۔

اخبارات و رسائل۔ اس مطبع عمومی کی مناسبت سے یہاں کے اخبارات اور رسائل کا تذکرہ کر دینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے افغانستان میں سب سے

پہلا اخبار امیر شیر علی خاں کے عہد میں سنہ ۱۲۹۰ میں شمس النہار کے نام سے ہفتہ وار نکلا تھا پھر سراج الملتہ والدین امیر حبیب اللہ خاں کے زمانہ میں سراج الاخبار نکلا لیکن درحقیقت امیر امان اللہ خاں کے زمانے میں لوگوں کو اخبارات کی طرف توجہ زیادہ ہوئی امان افغان کے نام سے سرکاری اخبار کابل سے نکلنے لگا اور اسی زمانہ میں جنرل نادر خاں نے جلال آباد سے سنہ ۱۳۰۰ میں اتحاد مشرقی کے نام سے دوسرا اخبار نکلوایا۔ بہر حال اس وقت یہاں سے جو اخبارات اور رسائل نکل رہے ہیں ان کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ اصلاح کابل شاہ نادر خاں بچہ سقا کے فتنہ کے خلاف جب مصروف جہاد تھے تو اس نام سے یہ موقت اخبار اپنے مسکر کیمپ سے نکلوایا کامیابی کے بعد اس کو مستقل طور سے سرکاری اخبار کی حیثیت سے جاری کر دیا یہ اخبار چار بڑے صفحوں میں نسخہ ٹائپ میں چھپتا ہے زبان فارسی ہے اس میں زیادہ تر اخلاقی، ادبی، تجارتی، مذہبی، قومی اور سیاسی مقالات شائع ہوتے ہیں پھر تمام دنیا کی خبریں اس میں دی جاتی ہیں پھر مقامی خبریں اور حکومت کے اعلانات اور گزٹ ہوتے ہیں مدیر کا نام برہان الدین کشمکی ہے ملک کے اندر ۳۰ افغانی اور باہر نصف پونڈ قیمت ہے۔

۲۔ انیس۔ کابل یہ اخبار آج سے چھ برس پہلے سنہ ۱۳۰۰ شمسی میں خیر سرکاری یعنی قومی حیثیت سے نکلا تھا اور اب تک نکل رہا ہے اور اس کی

حیثیت اب بھی سرکاری کے بجائے قومی ہے اس کے موجودہ اڈیٹر کا نام محمد امین خاں فوگیا نی ہے ہفتہ میں ایک دفعہ شائع ہوتا ہے۔

۳۔ اتفاق اسلام، ہرات یہ اخبار سنہ ۱۳۹۹ شمسی میں نکلا تھا، اور اب تک کہ سنہ ۱۳۱۳ شمسی ہے یہ نکل رہا ہے ہندوستان کے موجودہ افغان جنرل کونسل صلاح الدین خاں سلجوتی بھی اس کے اڈیٹر رہ چکے ہیں موجودہ اڈیٹر میر محمد عثمان اکینبی ہیں۔

۴۔ بیلاد۔ مزار شریف یہ سنہ ۱۳۱۳ شمسی سے نکلتا ہے، قدیم خراسان کا نام آج مزار شریف ہے کہ یہاں حضرات علی کرم اللہ وجہہ کافرار ہونا مشہور ہے اور اس لئے اس کا نام مزار شریف مشہور ہو گیا ہے یہ ردی ترکستان سے ملحق ہے اس کے موجودہ اڈیٹر کا نام مجاہد ہے۔

۵۔ طلوع افغان، قندھار یہ اخبار بھی سنہ ۱۳۱۳ شمسی سے نکل رہا ہے پہلے اس کی بھی زبان فارسی تھی مگر اب پشتو ہے، اور اس کے موجودہ اڈیٹر عبدالحی خاں ہیں قندھار آج کل پشتو تحریک کا مرکز ہے۔

۶۔ اتحاد۔ خان آباد قلعہ اس کی اشاعت بھی سنہ ۱۳۱۳ شمسی سے اور اب تک نکل رہا ہے اس کے موجودہ اعزازی اڈیٹر غلام جیلانی خاں جلالی ہیں۔

ان اخبارات کے علاوہ چند رسالے بھی خاص شہر کابل سے نکل رہے ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ مجلہ کابل۔ یہ انجمن ادبی کا رسالہ ہے اور علمی و ادبی و تاریخی

۱۰۰ مضامین پر مشتمل ہیں ہینہ شائع ہوتا ہے اس میں افغانستان کے تمام بڑے بڑے ادباء اور شعراء کے مضامین اور اشعار چھپتے ہیں غیر زبانوں کے محققانہ مضامین بھی ترجمہ ہو کر اس کے اوراق میں جگہ پاتے ہیں اعلیٰ درجہ کی تصاویر اور بلاک کے نقشے بھی اس میں ہوتے ہیں یہ تین سال سے نکل رہا ہے نصف پونڈ قیمت ہے۔

۲۔ اثینہ عرفان۔ یہ رسالہ گو امیر امان اللہ خاں کے زمانہ میں ۱۲۰۱ شمسی میں نکلا تھا مگر بند ہو گیا تھا، نادری خاں کے زمانہ میں یہ دوبارہ نکلا اور اب تک نکل رہا ہے یہ افغانستان کی وزارت تعلیم کا رسالہ ہے اس میں مدارس و مکاتب کے مدرسین و معلمین اپنے مضامین و تراجم شائع کرتے ہیں، اور مدرسوں کی رودادیں وغیرہ چھپتی ہیں، اڈیٹر کا نام ہاشم خاں شانی ہے، کابل میں نو افغانی صوبوں میں وٹل افغانی اور ہندوستان میں ساڑھے چار روپیہ قیمت ہے۔

۳۔ مجلہ اقتصاد۔ اس رسالہ میں تجارتی، زراعتی، مالیاتی، صنعتی انغرض معاشی مضامین شائع ہوتے ہیں یہ بھی نادری خاں کے عہد حکومت کی یادگار ہے تین سال سے جاری ہے ہینہ میں دو دفعہ شائع ہوتا ہے محمد نیاں اس کے اڈیٹر کا نام ہے اس کی قیمت افغانستان میں چھ افغانی ولایات میں سات افغانی اور باہر اشدنگ ہے اس رسالہ کو یہاں کی وزارت تجارت کا نمائندہ سمجھے۔

۴۔ مہجوعہ اردوی افغان۔ یہ افغانستان کا فوجی رسالہ ہے امیر امان اللہ خاں

زمانہ میں نکل کر بند ہو گیا تھا، نادر خاں کے زمانے میں دوبارہ نکلا افغانستان کی نظامی یعنی باقاعدہ فوج کے چند نوجوان فوجی افسر اس میں مضامین لکھتے ہیں اڈیٹر کا نام تید اکبر خاں ہے۔

۵۔ مجموعہ صحیفہ۔ یہ افغانستان کے محکمہ حفظانِ صحت کی طرف سے نکلتا ہے یہ پہلے امیر امان اللہ خاں کے زمانہ میں سنہ ۱۳۲۵ھ میں نکل کر بند ہو گیا تھا، دوبارہ نادر خاں کے زمانہ میں سنہ ۱۳۳۰ھ میں نکلا اور اب تک نکل رہا ہے، رشید لطفی اس کے اڈیٹر کا نام ہے اس کی قیمت کابل میں چھ افغانی ولایات میں آٹھ افغانی اور بیرون ملک میں چار شلنگ ہے۔

۶۔ حق علی الفلاح۔ یہ افغانستان کے محکمہ دینیات یا مجلس علماء کا مائندہ ماہوار رسالہ ہے اس میں مذہبی و اخلاقی مضامین لکھتے ہیں اڈیٹر کا نام میر غلام خاں ہے۔

ان تمام رسالوں کی زبان فارسی ہے اور سب مطبع عمومی میں نمائے میں چھپتے ہیں۔

کابل سے باہر دو اور رسالے نکلتے ہیں ہرات اور پشتو ہرات فارسی زبان میں شہر ہرات سے نکلتا ہے اور پشتو قندھار سے یہ قندھار کی محکم ادبی کا مائندہ ہے۔

پہ سالار شاہ محمود خاں کی رخصتانہ ملاقات

مطبع سے دارالامان واپس آیا تھوڑی دیر کے بعد پہ سالار سردار شاہ محمود خاں وزیر حربیہ ملنے آئے سر اس مسعود صاحب نے کمرہ میں سب

لوگ بیٹھے ادبیات پر گفتگو ہوتی رہی سردار شاہ محمود خاں سے کتاب خیام کا تذکرہ آچکا تھا اور یہ بھی مذکور ہوا تھا کہ اس کا ایک نسخہ میرے ساتھ آیا ہے اس وقت سردار موصوف نے اس کا اشتیاق ظاہر کیا اتفاق سے وہ نسخہ سید اس سعود صاحب کے مطالعہ میں تھا انھوں نے اس کی بہت تعریف کی اور نسخہ مذکور کی لوح پر یہ لکھ کر کہ ”میں اس کتاب کو مولوی سید سلیمان صاحب ندوی سے چرا کر سردار شاہ محمود خاں کے نذر کرتا ہوں“ ان کے حوالہ کیا میں نے اس کے نیچے یہ الفاظ لکھ دیے کہ ”میں اپنی محبت و عقیدت کی یادگار کے طور پر یہ ہدیہ پیش خدمت کرتا ہوں“ سردار موصوف نے بڑے شوق سے یہ کتاب لی تھوڑی دیر کے بعد وہ ہم لوگوں سے ایک ایک کر کے نبل گیر ہوئے اور آخری ملاقات کی رسم ادا کر کے رخصت ہوئے، حق یہ ہے کہ موصوف میں بڑی ہر دلعزیزی کی شان ہے اردو بہت اچھی بولتے ہیں کہ وہ ہندوستان کے ایک لائق استاد مولوی نجف علی خاں صاحب برادر ڈاکٹر عبدالغنی صاحب (پنجاب) کے شاگرد ہیں۔

پنجان گزر چکا ہے کہ سردار احمد خاں وزیر دربار کی دعوت پر شام کو بجے پنجان جانا طے پایا تھا ڈاکٹر سراقبال کو اعلیٰ حضرت سے رخصت نہ ملاقات کرنی تھی اس لئے وہ ہمارے ساتھ نہ جاسکے وہ شام کو وزیر خارجہ سردار فیض محمد خاں کے ساتھ وکلتا گئے اور باقی لوگ میں سید اس سعود پروفیسر ہادی، بیرسٹر غلام رسول اور سردار خاں گویا دو موٹروں پر پنجان روانہ ہوئے یہاں پنجان گئی وہ حیثیت ہے جو شملہ اور نیپالی تال کی ہے یا بمبئی

پونہ کی ہے یہ افغانستان کا شاہی اور عمومی تفریح گاہ اور سیر گاہ ہے یہ کابل سے ۱۸ میل دور اور ایک ہزار فٹ اونچا ہے مگر یہ اونچائی ایسی بتدریج اور رفتہ رفتہ آتی ہے کہ چلنے والے کو اونچائی کا احساس نہیں ہوتا پھر لطیف یہ ہے کہ یہ پہاڑوں کی سی بلندی نہیں بلکہ خود زمین مرتفع ہوتی چلی گئی ہے آب و ہوا کے لحاظ سے یہ کابل کا بہترین مقام سمجھا جاتا ہے اور غالباً اسی لیے کابل اور پغمان کے بیچ میں ناور خاں مرحوم نے خاص اپنی جاگیر کی زمین وقف کر کے وہاں سینی ٹیریم تربیت خانہ حیوانات اور مدرسہ زراعت قائم کیا ہے کابل سے پغمان کی طرف آدھی دو تہائی نئی سڑک ایسی عمدہ ہے جیسی ہندوستان کے بڑے شہروں میں سول لائٹس کی ٹھنڈی سڑکیں ہوتی ہیں اور دوسری آدھی سڑک بھی خاصی ہے تاہم اصلاح طلب ہے کابل کے حدود سے نکلنے کے ساتھ ہی عجیب کیفیت انگیز مناظر گزرنے لگے سڑک کے دونوں طرف چنار کے زرد درخت اور کہیں آبلو کے سُرخ پھولوں والے درخت کہیں اخروٹ کے درخت جا بجا چشمنے اور آبجو جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی فضا میں زرد اور سُرخ پھولوں اور پتوں کی چادریں پھیلی نظر آتی تھیں یہ یہاں خزاں کا ہیمنہ تھا جس کی یہ خزاں ہے اس کی بہاؤ کیسی ہوگی۔ ع قیاس کن زگلستان من بہار مرا

راستے میں سینی ٹیریم تربیت خانہ حیوانات اور مدرسہ زراعت کی عمارتیں گزریں واپسی میں ان کے دیکھنے کا خیال تھا اس لئے آگے بڑھ گئے پغمان جیسے جیسے قریب آتا جاتا تھا فضا کی رنگینی ہوا کی برودت اور درختوں

بہار بڑھتی جاتی تھی سب نے پہلے پٹمان کا صدر دروازہ یا بھاٹک ملا جو بجائے خود ایک چھوٹی سی عمارت تھی اس کے بعد شاہی قیامگاہ کی عمارت آئی پھر باغ عمومی (پبلک گارڈن) آیا جو پبلک کی سیر و تفریح کا مقام ہے بالآخر پٹمان کی سب سے مرتفع سطح پر ہم پہنچ گئے جو اس بہشت زار کی فردوس بریں ہے یہاں دو منزلہ مختصر لیکن بلند عمارت ہے سردار احمد علی وزیر دربار ہیں مقیم تھے وہ نیچے مائتر کر آئے اور جہانوں کو اوپر کی منزل پر لے گئے اور ایک ایسے کمرہ میں بٹھایا جس میں ہر طرف شیشے لگے تھے اور اس لحاظ سے اس کو شیش محل کہنا چاہئے اس وقت موسم سرد تھا اور ابر بھی تھا اس لئے شیشے کے یہ سب دروازے بند تھے مگر یہاں بیٹھنے والوں کی مشتاق نگاہیاں شیشوں کو پار کر کے جہاں تک پہنچ سکتی تھیں فضا کی بلندی میں سیدھے اور راست قامت درختوں کے جھنڈ اور زرد اور سُرخ پھولوں کے درختوں کی قطاریں اور زمین کی سطح پر رنگ برنگ پھولوں کی خوش آئند مرتب ہندسی شکلیں آنکھوں کو پر نور اور دونوں کو ممد و رکھ رہی تھیں پروفیسر (ادبی) ایران کی سیاحت کی ہے وہ کہتے تھے کہ یہ بالکل ایران کا منظر ہے جنھوں نے کشمیر دیکھا تھا وہ کہتے تھے کہ خاص یہ مقام کشمیر سے زیادہ دلپذیر ہے۔

اسی شیش محل کمرہ میں خوش سلیقہ میزبان نے چائے کی دعوت کا سامان کیا تھا میز پر مختلف قسم کے بسکٹوں اور مٹھائیوں کے علاوہ کابل کے اچھے سے اچھے میوے تھے مختلف رنگ کے انگوروں اور میووں کو خوبصورت ظروف میں مناسب رنگ کے پتوں اور پھولوں سے اس طرح مزین کر کے

رکھا گیا تھا کہ میز لذتِ کام و دہن ہونے کے علاوہ فردوسِ نظر بھی معلوم ہوتی تھی۔

لوگوں نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق چائے اور کافی پی سیدر اسعود صاحب نے کشمیری چائے کی فراہم کی تھی وہ بھی بن کر آئی گورنگ تو کشمیری چائے کا ضرور تھا مگر مزہ ہمارے ہندوستان کے کشمیری بھائیوں کی چائے سے کم تھا، افغانستان میں چائے کی پیالی کئی پیالیاں پی جاتی ہیں، مگر صرف پہلی پیالی میٹھی ہوتی ہے، باقی تلخ مگر یہ تلخوش، تو مجھے ”صوفی“ کو ام السجاست ہی معلوم ہوئی،

میز پر زیادہ تر یورپ کے مختلف شہروں کے مناظر پر گفتگو ہوتی رہی سردار احمد خاں مدت تک یورپ رہے تھے اور اکثر شہروں میں کئی کئی مہینے جا کر ٹہرے تھے۔ سیدراس مسعود اور سردار موصوف انھیں شہرِ اہل اور وہاں کے مختلف ہوٹلوں پر انہار رائے فرماتے رہے۔

چائے سے فارغ ہو کر سب لوگ نیچے اترے کابل سے ایک نوٹو گرافر بلوایا گیا تھا وہ نیچے موجود تھا وزیر مدوح نے پہلے سب کا ایک گروپ بلغ کی ایک اونچی سیڑھی پر لیا اسی کے سامنے انسانی ہاتھوں کی کاریگری سے چند اوپر نیچے پتھروں سے قدرتی چٹانوں کی نقل بنی ہوئی تھی حاضرین میں ہر ایک الگ الگ ان پتھروں پر بے ترتیب بیٹھ گیا اور اس بے تکلف فطری نشست کی پھر مصنوعی نقل اتاری گئی اس شاہی بلغ سے نکل کر اب ہم لوگ بلغ عمومی کی طرف چلے پیدل چلنے میں محسوس ہو رہا تھا کہ اب بلندی سے

ہم نشیب میں اتر رہے ہیں تھوڑی دیر چل کر وہ باغ آگیا اس باغ کو دیکھ کر
 دل باغ باغ ہو گیا، اُلٹا کہہ کیا باغ تھا گزشتہ زمانہ کی تو خبر نہیں سیکھ
 آج بے تکلف کہا جاسکتا ہے کہ اس سلیقہ کا باغ قیومیوں نے شاید ہندوستان
 میں بھی نہیں لگایا ہوگا، درختوں کو چھوڑ کے یہ پر لطف مناظر کشمیر کے سوا
 ہندوستان میں وہ کہاں سے لاسکتے تھے یہ خزاں کا موسم تھا، میرنجی کے
 بجائے پتوں میں زردی چھائی تھی سرو و چنار کے درخت اور قسم قسم کے
 پھولوں کی بہار اور ان کی ترکیب و ترتیب کس کس چیز کا ذکر کیا جائے۔
 پہاڑیوں پر سے ہر طرف قدرتی چٹنے بہہ رہے تھے باغ کے بیچ میں ایک قطار
 میں پانچ فوارے چھوٹ رہے تھے جن کا پانی بلا سبب انعم پچاس ساٹھ
 فیٹ اوپر چھوٹ رہا تھا، اور وہاں سے ہلکی ہلکی پہاڑیں بن کر فرش زمین پر
 گر رہا تھا۔

یہاں بھی ان پانچوں فواروں کی طرف پشت کر کے (بیک گروئنڈ) ایک
 مرقع لیا گیا۔

دریائے کابل - یہاں سے نکل کر دریائے کابل کی طرف چلے باغ کے بعد
 شہر تھی اور شہر کے بعد کچھ ہٹ کر کابل کا نازنین "دریا بہہ" ہا تھا دریا
 کابل کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے ہم ہندوستانیوں کو جو گنگا اور جمنا کے دیکھنے کے
 عادی ہیں اس کو دریا کہنے اور ماننے میں بہت کچھ تامل ہو گا یہ دریا بہا جہاں
 ہم کو نظر آیا اس کا عرض کہیں دو تین گز سے زیادہ نہیں دیکھا باریں ہم اس کے
 طول کا یہ عالم ہے کہ یہ کابل سے چل کر ہندوستان کے دریائے سندھ تک

مگر تپے جاڑوں میں اس میں برف جمتی ہے اور پھر پورے سال بھر اس کی روانی قائم رہتی ہے سنا ہے کہ جاڑوں کے زمانہ میں افغان آتے ہیں اور لات مار کر برف کو توڑ ڈالتے ہیں اور نیچے کے ٹھنڈے پانی سے صرف وضو بلکہ غسل بھی کرتے ہیں ہندوستان کے لوگوں کو تو اس تصور سے بھی سردی معلوم ہونے لگے گی دریا کے نیچے اور دائیں بائیں ہر طرف پتھر کی سیلیں پڑی ہیں اور انھیں پر سے "پھسلتا ہوا اور اٹکتا ہوا" یہ بہتا رہتا ہے اس دریا پر آنے کی غرض بھی فوٹو لینا تھی مگر دریا کے نیچے ہونے کی وجہ سے دریا کی روانی کے ساتھ مرقع نہیں کھینچ سکا بالآخر دریا کو پیچھے کر کے سڑک پر کھڑے ہو کر چوتھا گروپ لیا گیا۔

اس کے بعد ہم لوگ موٹروں پر بیٹھ کر کابل کی طرف روانہ ہوئے خیال تھا کہ راستہ میں سینی ٹیریم وغیرہ دیکھیں گے مگر واپسی میں اتنی دیر ہوئی کہ ان عمارات کو دور سے دیکھنے کے سوا اتر کر دیکھنے کا موقع نہیں ملا مگر بیرسٹر غلام رسول خاں ان کو دیکھ چکے تھے ان سے سن کر اور دوسرے جہاں کابل سے جو کچھ معلوم ہوا وہ سپرد قلم کیا جاتا ہے۔

دارالصحت یا سینی ٹیریم۔ اخیر جنگ انگریز و افغان کے کامیاب نتیجہ کے بعد امیر امان اللہ خاں نے جنرل نادر خاں سپہ سالار کو ان کے خدمات کے صلہ میں کابل و پغمان کے بیچ میں ایک زمین جاگیر میں دی تھی جس کا نام علی آباد نادر خاں نے اپنے زمانے میں باتفاق اطباء دارالصحت (سینی ٹیریم) کے لئے مندرج سمجھ کر اس میں دق و بل کے مریضوں کے لئے اقامت گاہ بنوایا اس دارالصحت

کی عمارت اور دیگر مصارف کے لئے بھی شاہِ نادر خاں نے اپنی جیب سے روپیہ دیا۔ عمارت سے منتر لہے ساتھ مریضوں کے رہنے کے لئے اس میں کمرے بستر اور راحت کے دوسرے سامان ہیں سانسے عمدہ باغ خوبصورت رویشیں چمن زار اور سڑکیں ہیں۔

تر بیت خانہ حیوانات۔ اسی کے قریب اسی راہ پر حیوانات کی پرورش اور ان کی عمدہ نسل لینے کا محکمہ ہے جس کا نام ”دارہ تربیت حیوانات و نسل گیری“ ہے اس دارہ کے افسرِ اعلیٰ کا نام محمد یوسف خاں ہے ہمارے رفیقِ غلام سولہ جنھوں نے اس کو دیکھا تھا اس کی بڑی تعریف مجھ سے کی یہاں جانوروں کی علمی اور سائنس فک طریق سے بہترین پرورش اور علاج کا سامان ہے اور عمدہ نروں کے ذریعہ سے اچھی اور قوی بچوں کی نسل لینے کا پورا اہتمام ہے۔

بعض احباب کی ملاقات۔ پٹنہ سے سیدھے دارالامان کو واپسی ہوئی بعض احباب ملاقات کو آئے مولوی بشیر صاحب مدد جمعیت مجاہدین چمر قند مولانا محمد میاں صاحب (المعروف بنصور) یہ مولانا عبداللہ صاحب انصاری مرحوم سابق ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی کے خلف الرشید اور مولانا محمد قاسم صاحب مدد دیوبند کے نواسہ ہیں اور ایک افغان عالم تھے جو حضرت شیخ الہند کے شاگرد تھے ان صاحب نے مولانا حسین احمد صاحب اور مولانا کفایت اللہ صاحب تک سلام پہنچانے کی خدمت میرے سپرد کی تھی جس سے بھگت اللہ کے عہدہ برآ ہو گیا ان کے ساتھ اخبار انیس کابل کے ادیٹر محمد امین خاں خوگیا بھی تھے تھوڑی دیر کے بعد منشی میرٹھس الدین مرحوم سابق ناظم حمایت اسلام پور

جو افسوس کہ اس جمعینہ وفات پا گئے) کے صاحبزادہ میر رحمت اللہ ہمایون اور
مقبول اتھی یہاں کے سرکاری کارخانہ گوگرد (دیا سلائی) کے مہتمم آئے۔
کل صبح کابل سے غزنین کو روانگی ہے، اس لئے احباب رخصت کرنے
کے لئے آ رہے ہیں۔

احباب کے رخصت ہونے کے بعد میں نے اور میرے ملازم نے مل کر
کل صبح کی روانگی کے لئے سامان سفر درست کیا اور اس سے فارغ ہو کر نماز
کے بعد کابل کی آخری شب بسر کرنے کے لئے ہسٹریہ دراز ہو گیا۔

غزنین کا سفر

تیس اکتوبر ۱۹۳۳ء غزنی صبح کو جب بیدار ہوا تو اس خیال سے خوشی ہو رہی
تھی کہ آج اس ”غزنین“ کو دیکھوں گا جس کا نام قلم سے سینکڑوں دفعہ لکھا، زبان سے
ہزاروں دفعہ لیا، اور آنکھوں سے لاکھوں دفعہ پڑھا، غزنین سلطان محمود کا غزنی
جس کا نام کبھی دنیا میں رعب و ہیبت بٹھاتا تھا جس کے آستانہ پر ارباب کمال کا
ہجوم رہتا تھا جس نے صدیوں دنیائے اسلام کی رہنمائی اور ہندوستان پر
فرمانروائی کی عصری، فرخی، فردوسی اور سنائی کا غزنین جس نے ہمارے ادبیاتی
دنیا میں غیر فانی شہرت حاصل کی اور جس کی سیاسی تاریخ مورخین عالم کی تحقیقات کا
مدت سے موضوع بحث ہے صبح اٹھ کر ضروریات سے فراغت کی بندھے ہوئے

اسباب کو دیکھا بھالا رخصت کرنے والے احباب سے بار بار مصافحے ہوئے اور چند روز کے اس قیام کی یاد کے وعدے ہوئے۔

خدام کو انعام عموماً دستور ہے اور یورپ میں تو یہ دستور قانون کی حد تک ہے کہ جب ہوٹل سے نکلے یا کسی اقامت گاہ میں پہنچے تو پہلے خدام کو ٹپ (بخش) دیجئے حتیٰ کہ چائے خانے اور ریستوران میں بھی اس "اخلاقی قانون" کی خلاف ورزی نہیں کی جاسکتی یہی چیز ٹرکی میں "بخشیش" کہلاتی ہے یورپ والے جب پرانی ٹرکی کا سفر کرتے تھے تو اس بخشیش کے مطالبہ کو بہت برے اور ذلیل زنگ میں پیش کرتے تھے لیکن ان کو اپنے ملک کا "ٹپ" براہیں معلوم ہوتا اس کی وجہ صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ "بخشیش" مشرقی مسکنت اور نرمی کی پہچان میں مانگی جاتی ہے اور درازی عمر وغیرہ کی مسلسل دعاؤں کے ساتھ اس کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے اور "ٹپ" یورپین خشکی کے ساتھ وصول کی جاتی ہے اور سر کو ذرا سی جنبش دے کر اور "تھینک یو" کہہ کر اس کی قیمت فوراً ادا کر دی جاتی ہے۔

ہندی مہمانوں نے طے کیا تھا کہ اس سرکاری مہمانخانہ کے خدام کو جنھوں نے ہماری مہمانی کے فرائض متعلقہ بہت خوبی سے انجام دئے تھے سو روپیہ انعام میں دئے جائیں لیکن چلتے وقت جب یہ رقم ان کو برائے نام دی جانے لگی تو انھوں نے بہت خوشی سے اس انعام کے قبول کرنے سے اس لئے انکار کیا کہ انھوں نے اپنے مہمانوں کا واجب فرض انجام دیا ہے جس کے لئے وہ کسی انعام کے مستحق نہیں ہیں ان کے اس فیصلہ سے بڑا عجیب ہوا اور ان کی اخلاقی بُرائی کا سکہ مہمانوں کے دلوں پر بیٹھا۔

یہ خدام نہایت ہوشیار، نہایت باادب اور باسیلقہ اور خاموش تھے اتنے دنوں میں ایک دفعہ بھی ان کے شوز و غل کی کوئی آواز کانوں میں نہیں آئی چائے، کھانا، بستروں کی درستی اور کمروں کی صفائی وغیرہ کے تمام کام وہ نہایت غربی اور خاموشی کے ساتھ انجام دیتے تھے ان کی وضع یہ تھی سیاہ پینٹ، سیاہ موٹ، سپید قمیض، پاؤں میں بوٹ اور سروں پر بالوں کی افغانی ٹوپیاں۔

کابل سے روانگی۔ حکومت نے اپنے مہانوں کے آرام سفر کا اہتمام بڑی خوبی سے کیا یہ بیان شاید پہلے گزر چکا ہے کہ کل مملکت افغانستان میں سفر کی پرانی منزلیں دس بارہ میل پر ہوتی تھیں ہر منزل پر حکومت کی طرف سے ڈاک بنگلے یا سرکاری اقامت خانے بنے ہوئے ہیں جس میں قیام کے ہر قسم کے سامان و اسباب مہیا ہوتے ہیں اب موٹروں کی تیز رفتاری نے اس منزل کو دور تر کر دیا، اب یہ بنگلے اتنی اور تنو میل کے بعد آتے ہیں۔

حکومت نے مہانوں کے قیام و انتظام کے لئے متوقع قیامگاہوں میں اطلاعی احکام بھیج دیئے تھے اور نگران کار اور میزبان کی حیثیت سے سرور خاں کو یا کو متعین کیا تھا کہ وہ مہانوں کے ساتھ حکومت افغانستان کی آخری سرحد تک جائیں اور وہاں سے پہنچا کر واپس آئیں۔

سواری اور بار برداری کے لئے حکومت نے دو عمدہ موٹروں اور دو لاریوں کا انتظام کیا تھا ایک موٹر پر خاکسار، ڈاکٹر اقبال اور بیرسٹر غلام رسول اور دوسرے پر سردار اسلمود پروفیسر مادی، جناب سرور خاں، گویا اور عبد المجید صاحب

نمائندہ سفارت خانہ افغانستان، دہلی سوار ہوئے ایک لاری کھانے کے سامان اور کھانا پکانے والے اور کھلانے والے ملازمین کے لئے تھی اور دوسری لاری پر ہمانی کا سامان و اسباب تھا ساتھ ہی حکومت نے ہمانوں کے فوجی اعزاز اور حفاظت کی غرض سے دس بارہ سپاہیوں کا ایک دستہ ساتھ کر دیا تھا، وہ بھی انھیں لاریوں پر سوار تھے اس دستہ کا افسر جس کو غنڈہ مشر کہتے ہیں جو جلال آباد کے پاس گردیز کے سادات میں سے تھا (نام بھول گیا) افسر مذکور بھی ہمارے ساتھ موٹر کی اگلی سیٹ پر سوار کے ساتھ بیٹھا تھا۔

ہم لوگوں کی روانگی میں ملنے ملانے کے باعث کچھ تاخیر ہو رہی تھی اس لئے لاریوں کو آگے روانہ کر دیا گیا، آٹھ بجے کے قریب ہم لوگ بھی روانہ ہو گئے۔ کابل سے غزنین تک۔ کابل سے غزنین ۸۲ میل ہے موٹر میں دشت و جبل اور نشیب و فراز کو لمحہ بہ لمحہ طے کرتی ہوئی اور خاک اڑاتی ہوئی رواں تھیں راستہ بہت حد تک صاف تھا سڑکیں عموماً اچھی حالت میں تھیں زمین زیادہ تر ہموار تھی دور دور پہاڑ بھی نظر آتے تھے اور ان کے دامنوں میں وسیع میدان اور وادیاں پھیلی تھیں ان وادیوں میں پہاڑی چٹنے بہہ رہے تھے جن کے سبب سے یہ وادیاں موسم بہار میں سرسبز ہو جاتی ہیں اور کاشت کے کام میں آتی ہیں یہ تمام زمین قابل زراعت تھی اور خوشی کی بات ہے کہ افغان کاشتکار اس میں پوری محنت سے کھیتی کرتے ہیں کابل سے میکرو غزنین تک کھیتوں کا یہ سلسلہ برابر ملتا چلا گیا مگر اس وقت کسی کھیت میں بھی کوئی چیز بوئی ہوئی نہ تھی یہاں کی کاشت کا زمانہ گرمیوں میں آتا ہے جب برف گھل کر زمین کو شاداب کرتی ہے۔

یہاں گھاؤں کی آبادیوں کا اصول یہ ہے کہ یہ چشمنے جدھر جدھر مڑتے ہوئے بہتے ہیں انھیں کے قریب تھوڑی تھوڑی دو پر گھاؤں آباد ہوتے ہیں پھر قدرتی اسباب سے جب یہ چشمنے بھی خشک یا بند ہو جاتے ہیں تو یہ گھاؤں بھی مٹ جاتے ہیں اور دوسری جگہ منتقل ہو جاتے ہیں کہیں ایسا نظر آیا کہ شبنہ گھاؤں کی ایک سمت سے دوسری سمت کو رخ کر لیا تو گھاؤں کی آبادی نے بھی ادھر سے اپنے جھونپڑے اٹھا کر اُدھر ڈال دئے دیواریں مٹی کی اور چھتیں بھی عموماً مٹی کی ہوتی ہیں اور بارش کی کمی کے سبب سے یہ چھتیں یہاں سستکھم رہتی ہیں۔ چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کا غیر منقطع سلسلہ نظر کے سامنے تھا ان پہاڑیوں کے سبب سے کہیں گھٹیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آگے راستہ بند ہے اور ان پہاڑیوں پر چڑھ کر جانے کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہ ہو گا مگر جیسے جیسے آگے بڑھتے جاتے تھے راستہ وا دیوں میں گھوم گھوم کر بہت صاف نکلتا آتا تھا۔

پشاور اور کابل کے درمیان جو خوفناک پہاڑی راستہ ہے اس کے بالمقابل ہم اس راستہ کو نہایت صاف میدانِ راستہ کہہ سکتے ہیں کہیں کہیں بیچ میں نشیب تھا اور اس کی دونوں طرف کی زمینیں بلند تھیں ایسے موقعوں پر عموماً پل بندھے تھے لیکن ایسے مقامات بھی آئے جہاں پل سرے سے نہ تھے یا ٹوٹ گئے تھے بظاہر شکل نظر آتا تھا کہ اس اتار چڑھاؤ کو موٹریں کیسے طے کر سکیں گی ان افغانی شوفروں کی تعریف کرنی پڑتی ہے کہ وہ اس آسانی سے موٹروں کو اتار اور چڑھا لیتے تھے کہ ہم کو ذرا بھی تکلیف محسوس نہیں ہوتی تھی۔

راستہ میں ایک دو پہاڑیاں ایسی بھی آئیں جن کے اوپر ہمارے رفیق فوجی

افسر نے بتایا کہ افغانی قلعے ہیں اور ان میں سرکاری فوج رہتی ہے۔

راہ میں لاریاں مل رہی تھیں جن پر تجارتی سامان آ جا رہا تھا، پرلنے فائدہ کے اونٹ اور گدھے بھی بوجھ سے لدے ہوئے آ جا رہے تھے خانہ بدوش قبیلے اور خاندان جن میں عورت مرد اور بچے سب تھے پیادہ اور گدھوں پر سوار ملتے جاتے تھے ان کے ساتھ ساتھ ان کے رفیق کتے بھی ہوتے تھے کبھی کبھی گدھوں کے اوپر مرغیاں بھی بیٹھی نظر آتی تھیں جو عجیب دلچسپ معلوم ہوتی تھیں۔ اب دوپہر کا وقت تھا مگر دھوپ میں حدت ام کو نہ تھی بلکہ کافی سردی تھی سردی کے پورے لباس پہننے کے باوجود موٹر کی شیشے کی کھڑکیاں اٹھاتی تھیں کہ ہوا اور غبار سے حفاظت رہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ ہم کو راستہ بھر کوئی پزندہ نظر نہیں آیا، شاید یہ سب ہو کہ اس ملک میں یہ کاشت کا زمانہ نہ تھا اور میدان غلہ سے خالی تھا۔ غزنین۔ ایک بجے دن کے قریب غزنین کا سواد نظر آیا مشتاق نگاہیں اوپر کو اٹھ رہی تھیں مگر ہر باز کام واپس آ جاتی تھیں ہمارے خیال میں پرانی دہلی کے کھنڈر کے مناظر تھے اور ہم سمجھے تھے کہ ہم کو قلعہ مسجدوں اور عمارتوں کے منار اور گنبدوں سے نظر آئیں گے لیکن ہماری مشتاق نگاہوں کے استقبال کے لئے اس قسم کی کوئی چیز اُدھر سے نہیں آ رہی تھی!

موٹریں رفتہ رفتہ اپنی چال سست کر رہی تھیں یہاں تک کہ آبادی کا سواد سامنے آ گیا شہر پناہ سے باہر ایک بلندی پر سرکاری ہمان خانہ کی عمارت تھی موٹریں اس کے احاطہ میں داخل ہو کر اس کے بڑے دروازہ کے سامنے

جا کر رکیں اور ہم لوگ غباروں میں اٹے ہوئے سوروں سے باہر نکلے استقبال کیلئے حکومت کی طرف سے تو ماہدان (یہاں کی فوج کو روپوں کا افسر اعلیٰ) اور شہر کی فیس رئیس بلدیہ (میونسپلٹی کا چیرمین) موجود تھے ان دونوں نے ہم کو خوش آمدید کہا اور خواہش کی کہ ہم پہلے شہر کے بازار میں ایک چکر لگالیں عمارت مذکور کے پائے میں ایک خیابان تھا اس سے نیچے اتر کر سڑک پر آئے اب ایک راستہ تو بازار کی پشت پر سے لنباؤ میں اخیر تک جاتا تھا اور دوسرا راستہ پھر بلندی پر چڑھ کر بازار کے عین وسط سے گزرتا تھا یہیں پر بازار اسے پہلے ہی برسرِ راہ ایک کچی مسجد تھی اور نشیب والی سڑک کے برابر برابر مسجد کے نیچے ایک نہر بہہ رہی تھی۔ بازار اہ۔ ہم نچلی سڑک سے اوپر مسجد کے پاس سے اوپر چڑھ کر بازار میں داخل ہوئے آگے آگے تو ماہدان صاحب ان کے پیچھے رئیس صاحب بلدیہ پھر مہمان سب سے پیچھے ہمارے ساتھ کے سپاہی بازار سے گزرے دکانیں سب کھلی تھیں چھوٹی چھوٹی سموی دکانیں تھیں بعض دکانوں پر چھنیٹ کی قسم کے ادنیٰ کپڑے بک رہے تھے زیادہ تر دکانیں پوسٹینوں کی تھیں چھوٹی پوسٹینیں جن کو شلو کہتے ہیں پندرہ روپیے کو اور بڑی میں پچیس کو کبھی تھیں بالائی حصہ زرد رنگ کا تھا آتینوں پر اور گلے پر ریشمی تانگے کا کام بنا تھا۔

ہم جس دکان کے سامنے گزرتے دکاندار کھڑے ہو جاتے اور السلام علیکم کہتے ”ماہدہ نباشی“ (تھکے نہ ہوں) کہتے یہ یہاں ہماروں کے لئے خیر مقدم کے الفاظ ہیں دکانداروں میں ہم نے تعجب کیسا تھا ہندوؤں اور سکھوں کو بھی دیکھا جن کے سروں پر زرد گیلڑیاں بندھی تھیں معلوم نہیں یہ کب سے یہاں آباد ہیں۔

اردو گراموفون۔ بازار دؤفر لانگ کے قریب لمبا تھا اوپر سے پرلے شہروں کے بازاروں کی طرح یہ بھی مسقف تھا بازار کو ایک سرے سے دوسرے تک ختم کر کے اسکی پشت کی سڑک سے ہم واپس آئے ادھر بھی بازار مذکور کی پشت سے لگی ہوئی صرف ایک سمت میں دکانیں تھیں درمیان راہ میں ایک دکان گراموفون کے بچنے کی آواز آرہی تھی غور جو کیا تو ریکا ڈکا گانا ممترا روو تھا کابل میں تو اردو زبان ثانی کی حیثیت رکھتی ہے اور ہندوستانیوں کی کثرت کی وجہ سے اس پر تعجب نہیں ہو سکتا لیکن غزنین میں جہاں شاید ہی کوئی ہندوستانی ہو اور وہ کی اس جہانگیر پر تعجب ہوا۔

مسجد۔ اس دوسری سڑک پر سے چل کر ہم اس مسجد تک پہنچ گئے جس کا تذکرہ پہلے کیا ہے ظہر کا وقت ہو چکا تھا چاہا کہ اس مسجد میں جا کر نماز ظہر ادا کروں مسجد ندی پر تھی اوپر زینہ سے چڑھ کر مسجد میں داخل ہوا ظہر کی جماعت ہو رہی تھی مگر دیکھ کر تعجب ہوا کہ وہاں وضو کا کوئی سامان نہ تھا دریافت کرنے پر معلوم ہوا نیچے سڑک کے کنارے کنائے نہر بہہ رہی ہے وہی گویا مسجد کا حوض ہے اور سیٹے یہاں کسی دوسرے سامان کی ضرورت نہ تھی ناچار یوں ہی مسجد سے اٹھ گیا یہ مسجد مٹی کی خام بنی ہوئی تھی دیواریں بھی کچی تھیں اور چھت اور فرش بھی سرکاری ہمانخانہ۔ غزنین کا سرکاری ہمانخانہ شہر سے الگ ایک بلندی پر واقع ہے عمارت خاصی ہے کمرے وسیع ہیں ہر کمرہ اوسط درجے کے فرنیچر سے آراستہ ہے یہ مباہل ملاقات اور کھانے کے کمرہ کے لئے ہے چند کمرے مہانوں کے سونے در آرام کرنے کے لئے ہیں کمروں میں فرش مہربان بستر پر دے سب قاعد لگے تھے

واپس آکر کھانا کھایا گیا چائے پی گئی جہانی کے فرائض رئیس بلدیہ بہت
خوبی اور اخلاق سے ادا کر رہے تھے کھانے وغیرہ سے فراغت کے بعد کچھ دیر
ہم نے آرام کیا پھر غزنین کے مزارات اور بقیہ عمارات کے دیکھنے کی تیاری کی
گئی چار بجے کے قریب ہم شہر کی زیارت کو نکلے۔

برانا غزنین - ہم غزنین کو اپنی کہنہ و فرسودہ دلی کی طرح آبا بھتے تھے اور یہ خیال
تھا کہ مرثیے کے بعد یہ زندہ ہو گا مگر یہ دیکھ کر اور سن کر کس قدر افسوس ہوا کہ صدیوں
پرانے غزنین کا نام و نشان بھی باقی نہیں باقیوں میں یہ پڑھا تھا کہ غزنویوں کے
اخیر دور میں علاء الدین غوری نے غزنین کو جلا کر خاک سیاہ کر دیا تھا اور اسی لئے
اس کا نام ”جہان سوز“ پڑ گیا تھا، مگر اس سے یہ خیال نہیں ہوتا تھا کہ وہ ایسا برباد
کو دیا گیا تھا کہ اس کی ایک اینٹ بھی اپنی جگہ پر باقی نہیں رہی تھی۔
علاء الدین جہان سوز - چھٹی صدی ہجری کے اوائل میں غزنویوں کا زوال اور غور
کے اقتدار کا آغاز ہو چکا تھا۔

اس خاندان کی چھٹی نیشیت پر عباس نامی ایک دلیر ستفاک بہادر پیدا
ہوا جس نے اس خاندان کی بنیاد رکھی اور اس کی نویں نیشیت پر ملک عز الدین حسین
جس نے غور کے کوہستان میں ایک چھوٹی سی ریاست کی بنیاد ڈالی اس کے سائے
نامور بیٹے ہوئے ان میں سے ایک کا نام قطب الدین محمد دومرے کا نام سیف الدین
سوری اور تیسرے کا نام علاء الدین جہین تھا قطب الدین محمد کا لقب ملک الجبال
تھا یہ قطب الدین اپنے بھائیوں سے خفا ہو کر غزنین چلا آیا اور اپنی داد و دھڑل
حسن سیرت و صورت کی بنا پر یہاں بہت ہر دلعزیز ہو گیا یہ بہرام شاہ غزنوی

علاء الدین تیغ زن کے ساتھ مخمور بھی تھا اس نے اس جٹن مسرت میں اپنے فخر میں ایک نظم کہی اور ایک طرف جب شہر میں قتل عام ہو رہا تھا اور عمارتیں جل کر خاک ہو رہی تھیں غور کا یہ نیر و مجلس عشرت میں میٹھا قواؤں کی زبان سے اپنا وہ فخریہ سن رہا تھا۔

جہاں داند کہ من شاہ جہانم چرخ دودہ عباسیہ نام
علاء الدین حسین بن حسینم کہ دائم باد ملک قاندا نام
چو برگلگون دولت بر نشینم یکے باشد زمین و آسمانم
ہمہ عالم بگردم چوں سکندر بہر شہرے شہر دیگر نشانم
بر آنا بودم کہ از او باش غزینم چور و دنیل جوے خوں برانم
ولیکن گندہ پیر اند و طفلان شفاعت میکند بخت جو انم
برنجیدم بدیشاں جان ایشان کہ بادا جان شان پیوند جانم
دنیا نے اس علاء الدین کو اس کی اس سنگدلی کا یہ بدلہ دیا کہ زبان خلق سے
اس کو جہان سوز کا لقب دلوا یا جو آج تک اس کے نام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔
پرانے غزنین کی تباہی و بربادی کی یہ مختصر داستان ہے جو سن ۷۴۷ھ اور
۷۴۸ھ میں وقوع پذیر ہوئی۔

نیا غزنین - پرانا غزنین غوریوں کے پورے ایام حکومت میں پھرتا آریوں اور
تموریوں کے زمانہ میں بھی اسی طرح بنے نام و نشان رہا سموں سی آبادی جو باقی رہ گئی
تھی کہتے ہیں کہ ایک سال کی سخت برف باری میں وہ بھی مٹ گئی، عبدالکریم علوی نے
لے جاس غری کی طرف اشارہ ہے۔

تاریخ احمد شاہ درانی میں (جو زیادہ تر امام الدین حسینی کی تاریخ سے جو مسئلہ میں لکھی گئی تھی غرض ہے) غزنین کے حال میں لکھا ہے۔

از قلعہ شش گاؤں بلدہ غزنین می رسد و آن سابق مکان تخت نشین سلطان محمود غزنوی
بود و زمان ماضی آبادی بسیار داشت یکبار بریں چنداں برف بارید کہ تمام شہر
زیر آں خراب شد بجز چند کس زندہ ماند از اں زان آں شہر آباد و شد بحال مردم
آجیک و دندان اندرون قلعہ قریب دوسہ ہزار خانہ آباد اند (ص ۴۲)

موجودہ شہر غزنین احمد شاہ ابدالی کے جانشین تیمور شاہ المتوفی ۱۷۷۳ء کی تعمیر ہے
اس کی حیثیت اول درجہ کے شہروں میں نہیں اور نہ یہاں گورنر رہتا ہے جس کی
میں یہ شہر آباد ہے بہت بڑی وسیع وادی ہے جس میں یقیناً بہت بڑا شہر آباد ہو سکتا
ہے اور مختلف صوبوں کے درمیان اس کی جائے وقوع تجارتی حیثیت سے اس کو
تھوڑی توجہ سے بہت بلند کر سکتی ہے۔

ملا قربان - غزنین کے کوڑوں، گوشوں، ڈھیروں اور قبروں کے واقف کا ملا قربان
نامی ایک پیر فرقت بزرگ ہیں مقامات کے دیکھنے کے لئے نکلنے سے پہلے سردخانہ
نے ملا قربان کو یاد کیا وہ بزرگ کیا آئے کہ گویا غزنین کی کہانیوں اور روایتوں کی
ایک زندہ کتاب ہاتھ آگئی عمر انسی نوے کے قریب ہوگی، مگر خمیدہ منھ میں انت
ہیں ہاتھ میں جریب وہ اس شان آئے اور غزنین کی بربادی و تباہی کی
داستان سنانے اور یہاں کے بزرگوں کے نام و نشان بتلنے لگے، بہر حال اس
خضر کی رہنمائی میں ہم پرانے غزنین کی سیر کو نکلے۔

غزنین کے آثار باقیہ۔ موجودہ شہر سے کئی میل دور وہ مقام ہے جو سلاطین مغلیہ کا پایہ تخت تھا اور اس مقام کی بالکل مخالف سمت موجودہ شہر کی دوسری طرف غزینہ کا پرانا گورِ غریباں ہے، قدیم آثار باقیہ میں یہاں اب صرف چند چیزیں باقی ہیں حکیم سنائی، سلطان محمود، سلطان مسعود اور سلطان ابراہیم کے مزارات اُن کے علاوہ ایک مزار حکیم بہلول دانا کی طرف منسوب ہے اور بعض دوسرے بزرگوں کے مزارات ہیں شاہی عمارتوں کے سلسلے میں صرف چند منار کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔

حکیم سنائی کا مزار۔ حکیم و شاعر اقبال کو حکیم شاعر سنائی کے مزار دیکھنے کا سب سے زیادہ اشتیاق تھا جہاں خانہ سے نکل کر پیادہ ہم حکیم موصوف کے مزار کی طرف چلے، یہ مزار موجودہ آبادی کی کچھ طرف آبادی سے ہٹ کر عام مسلمانوں کے گورِ غریباں میں واقع ہے عام شاہراہ کی سڑک چھوڑ کر ایک فرلانگ تک دوسرا راستہ گیا ہے، مقبرہ سے باہر چند پتھر ملی قبریں ہیں جن میں سے بعض پر متاخر زمانہ کے کتبے لگے ہیں حکیم سنائی کا مقبرہ ایک چھوٹے سے احاطہ کے اندر ہے پہلے مختصر صحن ہے جس میں بھی چند قبریں ہیں، ایک قبر پر لکھا ہے کہ ”یہ حکیم سنائی کے خادم خاص کی قبر ہے“ اس کے بعد خود حکیم کے مزار کی عمارت ہے، اوپر گنبد ہے نیچے پختہ قبر ہے، مزار کے اندر جانے کے لئے صرف ایک چھوٹا سا دروازہ ہے، قبر پختہ ہے اس کے اوپر پتھر ہے جس میں بخط عربی حکیم ممدوح کی تاریخ وفات منقوش ہے پوری عبارت تو یہ لکھی نہیں یادگار کے طور پر جو سطریں لکھی ہیں تھیں وہ صاف یل ہیں۔

کان وفات الشیخ العالم الفاضل العارف قطب المحققین طوعلی شکرستہ

نصاحت بلبل بوستان بلاغت مظہر اسرار معانی مطلع انوار...
 شیخ.... یعنی محمد والدین السدائی سنۃ خمس مائة وخمس عشرین
 گزشتہ سال کے معارف میں حکیم سنائی کی تاریخ وفات پر خاکسار کا ایک
 ضمون نکلا تھا جس میں موصوف کی وفات ۱۱۷۵ھ میں ثابت کی گئی تھی بعض محققین حال
 ۱۱۷۵ھ کی تاریخ ثابت کرتے ہیں اس کتبہ میں حضرت جامی وغیرہ کی عام روایت کے
 مطابق ۱۱۷۵ھ کی تاریخ وفات درج ہے اگر محقق ہو سکتا کہ یہ کتبہ حکیم کی وفات کے
 بعد ہی زمانہ قدیم میں لگا ہے تو اس سال وفات کے قبول کرنے میں کیا غدر ہو سکتا
 تھا مگر جہاں تک قیاس ہے یہ کتبہ بہت بعد کو لگایا گیا ہے اور اس میں وہی حضرت
 جامی کی بتائی ہوئی مشہور تاریخ لکھ دی گئی ہے واللہ اعلم

مزار کے اندر پہنچ کر بطریق مسنون دعا پڑھی۔

حکیم سنائی کی جلالت شان سے کون واقف نہیں ہم سب اس منظر سے
 متاثر تھے مگر ہم میں سے زیادہ اثر ڈاکٹر اقبال پر تھا، وہ حکیم مدوح کے سر جانے
 کھڑے ہو کر بے اختیار ہو گئے اور دیر تک زور زور سے روتے رہے اللہم اغفر لہ واد
 یہ توفیقوں کا جھونپڑا تھا یہاں سے نکل کر بادشاہوں کے محل کی طرف جانے کا
 خیال ہوا سرک پر موٹریں کھڑی تھیں یہاں سے سرک تک پیادہ چل کر موٹروں تک پہنچے
 افغانی سواروں کا دستہ۔ سرک پر پہنچے ہی تھے کہ اتفاقاً افغانی سواروں کا ایک
 مختصر دستہ سرک سے گزرا گھوڑوں کی شکل و صورت اور شرارت سپاہیوں کی عمدہ اور
 صاف وردیاں ان کی ہیبتناک ادنیٰ ٹوپیاں اور اسلحہ کی چمک دکھ کر ہمارے
 نومی جسم میں خون دوڑنے لگا، شگون نیک یہ لیا کہ سلطان محمود کے مزار پر جانے کا

خیال ہے، اور یہ سلطان کے خیالی جلوس کی سواری ہے، کاروانِ رفتہ کا یہ نشان قدم بھی بسا غنیمت معلوم ہوا آج جبکہ بڑے بڑے کشور کشا سلاطین اسلام غیر ملکی تسلط کی ذلت سے اپنی قبروں میں بچپن ہوں گے مین الدولہ کہتے الاسلام سلطان محمود اپنی قومی حکومت کے زیر سایہ آرام کی نیند سو رہا ہے۔

قدیم غزنین میں۔ موٹر میں ملا قربان ہمارے ساتھ تھے وہ ہر جگہ اپنے سنے سنائے معلومات کا اظہار کرتے جاتے تھے اصلی اور پرانا غزنین موجودہ آبادی کے پورے طرف ہے میرے اندازہ میں یہاں سے دو تین میل کے فصل پر واقع ہوگا، ادھر ادھر منتشر طور پر ٹیلے دکھائی دیئے بعض کچے مکانات آباد بھی معلوم ہوئے، سب سے پہلے دو آٹنے سائے بلند مینارے نظر آئے ان دونوں میناروں کے بیچ میں شاید فرلانگ ڈیڑھ فرلانگ کا فرق ہوگا ملا قربان نے کہا یہ سلطان محمود کے وقت کے دو مینار ہیں ان پر اس زمانہ میں جب سلطان کی سواری نکلتی تھی نغارے بجاتے تھے یہ دو مینارے پتلی لکھوری اینٹوں کے تھے۔

آگے بڑھ کر سڑک سے ہٹ کر ایک ٹیلہ پر ایک مزار کا قبہ دکھائی دیا ملانے بتایا کہ یہ بہلول دانا کا مزار ہے، پھر دوسری طرف ایک گنبد نظر آیا یہ بھی سڑک سے ہٹا ہوا تھا، ملانے نے کہا کہ یہ سلطان ابراہیم غزنوی کا مزار ہے، اس سے آگے ایک قبہ ملا جس کی نسبت یہ اطلاع دی گئی کہ یہ سلطان محمود کے باپ سلطان بکتگیں کا مزار ہے۔ یہ اپنی پرانی حالت میں تھے اور لکھوری اینٹوں سے بنے ہوئے معلوم ہوتے تھے سلطان محمود کا مزار۔ موجودہ غزنین سے سلطان کے مقبرہ تک سیدھی سڑک چلی گئی ہے مزار کے قریب پہنچ کر پہلے ایک مختصر سی آبادی ملی اس کو طے کر کے اگلی

مزار کے دروازہ کے قریب جا کر موڑیں کھڑی ہوئیں دروازہ سے پہلے ایک پہاڑی سے ایک چشمہ اوپر سے نیچے گرتا ہے اور پھر کراس مختصر آبادی کے لئے فطری واٹر ورکس کا کام انجام دیتا ہے، نیچے پتھر کا بنا ہوا ایک شیر کا دہانہ ہے اسی دہانہ سے ہو کر یہ پانی نیچے گرتا ہے ملانے کہا یہ چشمہ بہت پرانا ہے، اور سلطان کے زمانہ سے جاری ہے سرور خاں نے فرمایا یہی وہ کاریز ہے جس کا ذکر فلاں شاعر کے شعر میں آیا ہے (شعر مجھے یاد نہیں رہا)

نہر مذکور سے چند قدم کے فاصلہ پر مزار کا بڑا اور بلند دروازہ ہے اس کے بعد ایک چھتہ ہے جس کو طے کر کے ایک مختصر باغ میں پہنچے باغ کے ایک طرف سلطان کے مزار کا گنبد نظر آیا اندر داخل ہوئے تو سلطان کی قبر نظر آئی، آہ! یہ اس سلطان کی قبر ہے جو دیوار چین سے لیکر سومات گجرات تک کے ملکوں پر فرمانروا تھا جس کی ہیبت و جلالت سے بڑے بڑے گردن کش سر اطاعت جھکاتے تھے جس نے دنیا کے خزانوں کو غزنین کے گوشہ گوشہ میں بکھیر دیا تھا جس کے لشکر کے گھوڑوں کی ٹہپیں درخیز اور درہ کو ہاٹ کی پہاڑیوں سندھ اور راجپوتانہ کے بے آب دگیاہ صحراؤں اور بحر عرب کے ساحلوں ترکستان و خوارزم کی دادیوں خطا و ختن کے میدانوں اور ایران کے خیابانوں کو دم کے دم میں طے کرتی تھیں جس کے سپاہی گرمیوں کا موسم ایران و ترکستان کے فتنات میں اور سردی کے دن ہندوستان کے زیر و زبر کرنے میں بسر کرتے تھے جس کے دربار میں شعرائے غزنی کا وہ جھڑمٹ لگا رہتا تھا جس کی شکر دہنی سے آج فارسی زبان دنیا کی غیر فارسی زبان بن گئی ہے آج وہ سلطان کس بیکسی و بیجاگی کے عالم پر ایک سنان

باغ کے اندر یکہ و تنہا خاک بستر پر دراز ہے

تخیل کے کانوں کو فرخی کا مرثیہ مزار کی زبان حال سے اب تک سنائی دے رہا ہے۔

شہر غزنین نہ ہمان است کہ من ویدم پا چہ فتا و است کہ امسال مگر گویں شد کا

ملک امسال دگر باز نیامد ز غزا دشمنی روئے نہادہ است وریں شہر دویار

سیر می خوردہ گردی کہ بختہ است امروہ ویرخواست مگر رنج رسیدش ز خار

خیز شاہا کہ رسولان شہاں آمدہ اند ہدیہا دارند آوردہ فراوان و نثار

کہ تواند کہ بر انگیزد ازین خواب ترا خفتی خفتی گز خواب نگروی بیدار

خفتن بسیارے خواجہ خوبی تو نبود ہیج کس خفتہ نذیاست ترا زین کردار

یکہ مک بائے در خانہ بالیست نشست تابدید ندروی تو غزیران و تبار

بہ حصار از فرع و بیم تو رفتند شہاں توشہا از فرع و بیم کہ رفتی جہاں

شعرار بہتو بازار برافروختہ بود رفتی و با تو بیکبارہ برفت آں بازار

مزار کے اوپر جو گنبد بنا ہے اس کو امیر حبیب اللہ خاں مرحوم نے ۱۲۳۱ھ

میں بنوایا ہے جس کا کتبہ بخط نستعلیق فارسی میں سنگ مرمر کے ایک پتھر پر دیوار کے

اندر لگایا ہے مگر خود قبر سلطانی غالباً عہد قدیم کی تعمیر ہے کیونکہ اس کے اوپر سلطان

کی تاریخ وفات اور کلمات دعائیہ جس عربی خط میں لکھے ہوئے ہیں وہ خط کوئی کے

مشابہ ہے اور زبان بھی خالص عربی ہے یہ عبادت گاہ اور چاروں طرف اسی خط میں

لکھی ہوئی ہے جس کا پڑھنا آج بہت آسان نہیں ہے رداروی میں نے صرف

ایک سمت کی عبارت پڑھی جس میں سلطان کی وفات کی تاریخ منقوش ہے۔

توفی برحمة اللہ علیہ و نور حضرتہ و ابیض وجہہ عشیة یوم الخمیس

لسبع بقین^۱ من شهر ربیع الآخر لسنة احدى وعشرين واربعمائة
ترجمہ۔ وفات پائی سلطان رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی قبر کو دعا منور کر کے اور اس کے چہرہ کو روشن کر کے
پنجشنبہ کی شام کو ربیع الآخر کی سات راتیں باقی تھیں (یعنی ربیع الآخر کی بیسویں رات)

۱۳۲۱ھ

سلاطین غزنوی کی قدیم ترین تاریخ زین الاخبار میں بھی یہی تاریخ لکھی گئی ہے
وفات امیر محمود روز پنجشنبہ بودست سوم ربیع الآخر سنة احدى وعشرين اربع مائة (ہجری)
حضرت داتا گنج بخش لاہوری کے والد بزرگوار کا مزار
ان شاہی مزارات کی زیارت سے روٹے تو ڈاکٹر صاحب کو لاہور کی مساجد
سے حضرت داتا گنج بخش لاہوری جن کا مزار لاہور میں ہے ان کے والد ماجد کے مزار
کی تلاش ہوئی ملا قربان نے کہا میں وہ مزار جانتا ہوں چنانچہ ان کی ہدایت کے مطابق
موڑنے پرانے غزنین کے ویران و سنان میدانوں کو طے کرنا شروع کیا اور آخر ایک
مقام پر لے جا کر توقف کیا آگے موٹر کا راستہ نہ تھا چنانچہ ملا صاحب مع ڈاکٹر صاحب
وغیرہ اتر کر پیادہ گئے اور زیارت کر کے واپس آئے میں درویشینہ کی شکایت کے سبب
لائے خوار کا مزار جیکم سنائی کی توبہ کی حکایت کے سلسلہ میں ایک مجذوب فقیر نے
کا ذکر آتا ہے جس نے کہا تھا ”بکوری سنائی می خورم“ کہ سنائی سے بڑھ کر بیوقوف کون ہوگا

سے جناب خواجہ حسن نظامی صاحب نے اپنے سفر نامہ افغانستان میں اس کتبہ کو اس طرح پڑھا ہے ”ربیع
سبع عشر من ربیع الآخر سنة احدى وعشور واربعمائة“ (روشن پنجشنبہ، اربعہ الآخر سال ۱۳۲۱) اور یہ بڑھ کر
یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ”مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ سلطان کی وفات اس تاریخ کو ہوئی جو حضرت خواجہ نظامی
اولیاء محبوب الہی کی تاریخ وفات ہے“ (یعنی سترہ) مگر موصوف کی یہ خوشی بجا نہیں ان سے کتبہ کی عبارت
پچھلے میں ہو رہا ہے!

جو اپنے ہی جیسے انسانوں کی مدنِ دستاویش میں خرافاتِ نظم کرتا ہے۔ اور ان کو جگہ
 سنا تا ہے، حکیم پر اس مجذوب کے اس فقرہ کا اثر ہوا اور توبہ کی ملا قربان موجودہ
 غزنین کے بازار سے گزرتے ہوئے ایک گلی سے ایک مسجد کے اندر لے گئے
 اور بتایا کہ یہ اس لائے خوار کا مزار ہے۔

غزنین کی رات۔ قریب شام ان مقامات کی سیر و زیارت سے فراغت
 ہوئی سردی شروع ہو چکی تھی غزنین کا بل سے بھی ایک ہزار فیٹ بلند ہے
 اس لئے یہاں کا بل سے بھی زیادہ سردی ہے۔ مغرب کا وقت آیا تو انگیٹھیوں کا
 سامان ہوا۔

ساتھ کے سرکاری خدام نے کھانا تیار کیا اور بجے شب کے قریب میز پر
 کھانا چنایا دہی کا بل کے کھانے تھے غزنین کے سردے بھی عمدہ ہوتے ہیں
 کھانے اور نماز سے فارغ ہو کر سلطان محمود کے غزنین میں شب بسر کرنے کے لئے
 بستروں پر دراندہ ہو گئے۔

مقرر قلاتِ غلزی اور قندھار

منزلیں۔ ۳۱۔ راکتوبر کی صبح کو غزنین سے آگے روانہ ہوئے ہمارا مختصر قافلہ
 آج بھی دو موٹروں اور دو لاریوں پر مشتمل ہے غزنین کے بعد موٹر کی پہلی منزل مقرر
 ہوتی ہے اور دوسری قلاتِ غلزی مگر رفیقوں کی جلدی کے باعث آج مقرر قلات
 کی دو منزلیں ایک ساتھ طے کرنی ہیں۔

غزنین سے مقرر نوے میل ہے پہلے عموماً یہ راستہ سات منزلوں میں ختم
 کیا جاتا تھا پہلی منزل قلعة نانی، دوسری قرہ باغ، تیسری قلعة غوجان چوتھی قلعة

پانچویں چشمہ سرو چھٹی قلعہ ترین پھر قلات گربوڑ کے لئے یہ سات منزلیں چند گھنٹوں کا راستہ ہے چنانچہ ہم بجے صبح کو غزنین سے روانہ ہو گئے اور الجے دو پہر کو مقرر پہنچ گئے راستہ آ صاف اور ہموار تھا جگہ جگہ گاؤں لے وا دیوں میں کھیتوں کے بڑے بڑے تختے نظر آ جابجا چٹنے بھی بہہ رہے تھے۔

مقرر یعنی پرانا بہق۔ بہق ایک پرانے تاریخی شہر کا نام ہے جہاں سے بڑے بڑے ائمہ حدیث مؤرخین اور اہل ادب و انشا پیدا ہوئے ہیں یا قوت نے معجم البلدان میں بہق کے ملاقہ کو ایک پورا ضلع قرار دیا ہے اور جس کی جائے وقوع نیشاپور قوس ورجون کے بیچ میں بتائی ہے اور لکھا ہے کہ بہق کی ابتدائی حد سے نیشاپور تک ساٹھ فرسنگ ہیں (یعنی موجودہ ایک سو تیس میل) اس کا پرانا صدر مقام خسر و گرو تھا پھر سنوارا ہو گیا اس کے اندر تین سو اکیس گاؤں تھے اس کا فارسی تلفظ یہ ہے مکرعوبوں نے اپنے قاعدہ سے اس کی بہق بنا دیا اور وہی مشہور ہو گیا ابو بکر احمد بن حسین مشہور بہ امام بہقی شافعی جن کی سنن بہقی اور دلائل النبوة مشہور کتابیں ہیں یہیں کے تھے۔

نوجوان افغانوں کا دعویٰ ہے کہ پرانا بہق یہی ہے چنانچہ ہمارے فاضل افغان رفیق سفر سرور خاں گویا نے بڑے وثوق کے ساتھ مجھے اس کا یقین دہایا مقرر کے قریب دو قبروں کے روضے دکھائی دئے فاضل مذکور نے بتایا کہ ان میں سے ایک ابو الفضل بہقی کی قبر ہے اور دوسری ابو نصر مشکافی کی ابو الفضل بہقی غزنوی خاندان کا مشہور مورخ ہے سنگہ میں وفات پائی ہے ابو نصر مشکافی

بھی اسی عہد کا ادیب و مورخ ہے جس کی تصنیف مقامات پچھلے مصنفین کا اخذ
مقرر میں داخلہ اور روانگی۔ مقرر ایک وسیع و خوش نصاب میدان میں واقع ہے
آبادی بہت ہی معمولی ہے افغانوں کا ایک قوجی دستہ ایک افغان کرنل کی ماتحتی
میں یہاں رہتا ہے۔

مقامی سرکاری افسروں کو ہم لوگوں کے آنے کی اطلاع پہلے سے تھی جسے
ہی موٹر آکر رکے گا رڈ آف آنر نے جو پہلے سے وہاں کھڑا تھا ہمانوں کو اغوازی سلطانی
دی دل نے کہا اسلامی مملکت میں اگر غیر ملکی مسلمان بھی بیگانہ نہیں رہتا اور اس عزا کا
مستحق قرار پاتا ہے جو اس کو اپنے وطن میں بھی میسر نہیں آزادی اور غلامی کے درمیان
کتنا عظیم فرق ہے

یہاں کی سرکاری عمارت نہایت سلیقہ سے پختہ دو منزلہ بنائی گئی ہے
ادپر کی منزل ہمانوں کے لئے ہے متعدد کمرے ہیں جن میں خاصہ آرام وہ فریجیچر ہے
بیت الخلا جدید اصول (فلٹنگ سٹم) کے مطابق بنایا تھا عمارت بھی امینوں کی
معلوم ہوتی تھی عمارت کے پاس ہی چھوٹی سی نہر جاری تھی سامنے کچھ سرسبز و
شاداب درختوں کی قطار تھی۔

تعجب آتا تھا کہ ایسا خوش فضا اور پرسکون مقام اور آبادی سے یوں
خالی ہو اگر یہ مقام ہندوستان میں ہوتا تو بڑے بڑے امراء کی کوٹھوں سے
معمور ہوتا زمانہ کے انقلاب کی یہ کیسی عبرت انگیز تصویریں ہیں کہ کبھی ویرانہ
پر رونق شہر اور کبھی پر رونق شہر ویرانہ جاتا ہے۔

بالائی منزل پر جا کر ہم نے تھوڑی دیر آرام کیا پہلے گرم دودھ کا ایک ایک

پیالہ مہانوں کو پیش کیا گیا پھر بے دودھ کی سبز چائے آئی جس کا مزہ مجھے تو تازہ بنفشہ کے جو شانہ سا معلوم ہوتا ہے تھوڑی دیر کے بعد میز پر کھانا چنگیا کھانے سے فارغ ہو کر ہم آگے بڑھنے کو تیار ہو گئے چلتے وقت بھی نوجی دتہ نے اغرازی سلامی دی ایک بجے موٹروں نے قلات کی سمت حرکت کی راستہ صاف اور ہمار تھا۔

قلات غلزنی۔ قلات دوہیں ایک قلات بلوچ اور دوسرا قلات غلزنی پہلا بلوچستان میں واقع ہے جو آج کل ہندوستان کے ماتحت ہے اور وہ سرا غزنین اور قندھار کے بیچ میں ہے پہلے افغانستان کی سرحد بلوچستان تک تھی اور قلات بلوچ کا امیر شاہ افغانستان کا ماتحت تھا ۱۸۵۹ء مطابق ۱۲۸۵ھ میں شجاع الملک شاہ افغانستان کو دوبارہ تخت نشین کرنے کے لئے جو انگریزی فوج سندھ اور قندھار کے راستہ سے کابل گئی تھی اس نے واپسی میں قلات بلوچ کے امیر محراب خاں کو مہانداری کے دھوکے سے قتل کر کے قلات بلوچ پر قبضہ کر لیا مگر اس کے جو افریدیٹ نصیر خاں نے بڑی بہادری سے انگریزی فوج کو شکست دی غرض شاہ افغانستان کی امداد کا یہی بہانہ تھا جس نے قلات اور سندھ کو ہندوستان کا ماتحت بنا دیا۔

یہ تفصیل میں نے اس لئے کر دی کہ حال کے ایک مشہور مصنف نے قلات بلوچ کے محراب خاں کو قلات غلزنی کا حاکم بنا دیا ہے۔ قلات کی اصل مجھے قلات معلوم ہوتی ہے قلعہ کی جمع کثرت استعمال سے قلات ہو گیا ہے۔

مقررے ایک بجے پہلے گرجے کے سامنے کو قلات غلزنئی پہنچے یہ غلزی اور توخی
 افغانوں کی جانے سکر گئے تھے مگر قلات کی آبادی بہت ہی مختصر ہے یہاں
 کا سرکاری ہسپتال نہ کبھی دیواروں کا ہے گو وسیع ہے مگر پرانا بنا ہوا ہے ہمارے
 قتلے کی اطلاع یہاں پہلے سے بھی لیکن اتفاق سے خانساں موجود نہ تھا تھوڑی
 دیر میں بیچارہ دوڑتا ہوا آیا اور ہسپتال کے دروازے کھولے کمرے متعدد تھے
 اور سامان بھی سمیٹا ہوا ہر کمرہ میں پردہ دار مسہریاں تھیں اور مسہریوں پر بستر اور
 کمر لگے تھے ہم سب میں سے ہر ایک نے ایک ایک مسہری پر قبضہ کیا۔

ہسپتال کھلے میدان میں واقع ہے اس پاس کوئی آبادی نہیں سامنے
 پہاڑی ہے اس پر ایک قلعہ ہے جس میں افغانی فوج رہتی ہے قلعہ سامنے سے
 معلوم ہوتا ہے اس سے ذرا ہٹ کر قصبہ کی آبادی ہے قلات غلزن میں سے بھی ایک
 ہزار فیٹ بلند ہے اور کابل سے دو ہزار فیٹ اونچا یہ چار بجے شام کا وقت تھا
 مگر ہوا اتنی تیز چل رہی تھی اور ٹھنڈک ایسی تھی کہ اسراکتور کو عصر کی نماز کے لئے
 گرم پانی سے وضو کرنا پڑا۔

ہسپتال سے باہر کھلے میدان میں جو سطح زمین تھی ریت کی بڑی کثرت نظر آتی
 جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں پانی کا بہاؤ ہے اس کی دوسری دلیل یہ نظر آتی
 کہ مختلف رنگ کے پتھروں کے خوشنما اور چکنے ٹکڑے اور ٹکڑیاں بڑی کثرت سے
 ادھر ادھر پڑی نظر آتی تھیں چنانچہ چند جگہ ارا اور رنگین کنکریاں یا دگڑے کے ٹکڑے
 ہم نے چن کر رکھ لیں اسی طرح ۱۹۲۵ء کے سفر عرب میں پورٹ سوڈان کے ساحل پر
 بھی ہم کو ایسے ہی پتھر ملے تھے تو ہم نے وہاں سے بھی پتھر کے چند چھوٹے ٹکڑے

یادگار کے طور پر رکھ لئے تھے

مغرب کے بعد ہی یہاں ٹھنڈک ایسی ہو گئی جو ہمارے یہاں دسمبر اور جنوری کے مہینوں میں ہوتی ہے، چنانچہ آستانوں میں آگ جلائی گئی۔

ایرانی اور افغانی فارسی۔ یہاں رفقاے سفر میں سے پروفیسر مادی اور سرور خان گویا میں ایرانی اور افغانی فارسی کی باہمی فضیلت پر ایک دلچسپ گفتگو ہوئی پروفیسر صاحب ایرانی فارسی کے مدد تھے اور گویا اپنی مادری افغانی فارسی کے دیرینک مباحثہ رہا۔ گویا کا دعویٰ تھا کہ فارسی اصل میں ہماری زبان ہے ہم نے بخارا میں (سامانیوں کے عہد میں) اس کو پیدا کیا اور غزنویں میں غزنوی شعر کے ہاتھوں اس کو نشو و نما بخشا، ودکی سے لیکر غصائری، عجمی، اسدی، قسیمی، فردوسی، اخگر، سلمان اور سنائی وغیرہ ہمارے تھے اور انھیں کی سنجہ اور انہ کو ششوں کا نام ادبیات فارسی ہے پروفیسر صاحب نے سید سیدی حافظ اور متاخرین کے نام پیش کرتے تھے۔

سرور خان گویا نے ایرانیوں کی متکلم نہ زبان کا وہ خاکہ اڑایا کہ ہم لوگ ہنستے ہنستے ٹوٹ گئے انھوں نے کہا ہم کو اگر آپ کا شکریہ ادا کرنا ہے تو صاف صاف شکریہ اور سپاس ادا کریں گے، ایرانیوں کی طرح جھوٹی بناوٹ کے ساتھ بجان، شما اور بسر شما اور قربانت شوم نہیں کہیں گے ایران اور افغانستان میں فارسی کا جو جدید لٹریچر پیدا ہوا ہے اس کی نسبت کہا کہ ہم نے ادبیات جدی اور سنجیدہ لٹریچر پیدا کیا ہے اور انھوں نے صرف تفریحی ادبی آخر میں لہجہ پر گفتگوئی ایرانی اس لفظ کو جس کے آخر میں الف نون ہو واونون پڑھتے ہیں مثلاً ہمان کو ہمون اور آن کو اون (نون کے اظہار کے ساتھ) سرور خان نے جل کر کہا ”آقا!

درست است دوکانِ شما۔۔۔۔۔ است و زبانِ شما زبون، اس پر سنبے قہقہہ لگایا
 قلات کی رات۔ رات زیادہ آچکی تھی سنبے اپنے بستروں پر آرام کرنے گئے
 ہوا بڑی تیزی سے رات بھر چلتی رہی مگر چونکہ کھڑکیاں شیشوں کی تھیں اور وہ
 بھی بند اور کمروں میں آتش دان جل رہے تھے، اس لئے سردی نہیں لگی لیکن
 ساتھ کے افغانی سپاہیوں کو شاباشی دینی چاہئے کہ وہ اس کڑا کے کی سردی اور
 ہوا میں باہر چھو لہاریوں میں بہت آرام سے میٹھی نیند سوتے رہے۔

قلات سے روانگی۔ آج نومبر کی پہلی تاریخ ہے صبح سویرے آٹھ بجی گرم پانی
 موجود تھا وضو کر کے صبح کی نماز ادا کی ساتھ کے رفیقوں نے گرم پانی کی پیالیوں کی
 مدد سے چہرے صاف کئے تھوڑی دیر میں چائے آئی ناشتہ کیا چائے پی اور آگے
 بڑھنے کے لئے تیار ہوئے۔

روانگی کے وقت یہاں بھی فوجی دستہ نے اغزائی سلام کیا بجے کے قریب روانگی ہوئی۔
 قندھار کا راستہ۔ سردی کا وہی عالم تھا موٹے موٹے کپڑوں میں لپٹے اور اُپر
 ادور کوٹ وغیرہ پہنکر موٹروں میں بیٹھے موٹر کی کھڑکیاں کو بند تھیں مگر ہوا اور
 سردی کا اثر اس کے اندر تک سرایت کر رہا تھا۔

افغانستان کے اس حصے میں قلات تک اونچائی ہوتی چلی آئی ہے قلات
 نخلی کرنصف راستہ کے بعد سے اتار شروع ہو جاتا ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ
 کم اور گرمی بڑھتی جاتی ہے یہاں تک کہ قندھار پہنچکر پنجاب کے شہروں کے
 قریب قریب کا موسم آ جاتا ہے، ہندوستان میں اخیر جنوری میں جاڑوں کے دنوں
 میں دہلی سے بمبئی جائے تو اچھے خاصے گرم کپڑوں میں لپٹے ہوئے سوار ہو جائے

مگر بھوپال کے بعد سے سردی کا زور کم ہونا شروع ہوگا، منہاؤ کے بعد سے کپڑے اترنے شروع ہو جائینگے یہاں تک کہ جب آپ بمبئی پہنچیں گے تو بدن پر گرمی کے کپڑے اور ہاتھوں میں پنکھے ہونگے اسی طرح جیسے جیسے ہم قلات سے دور اور قندھار سے نزدیک ہوتے جاتے تھے جاڑوں کے کپڑے اترتے جاتے تھے۔

قلات سے قندھار تک کا راستہ اچھا نہیں عموماً راستہ گو ہموار ہے تاہم ہمیں کہیں کہیں چڑھائیاں بھی آتی جاتی تھیں راستہ میں ایک بہت بڑا افغانی قلعہ سامنے سے گزرا راہ میں چپٹے بھی جا بجا بہہ رہے تھے دیکھنے میں یہ علاقہ بھی سرسبز و شاداب معلوم ہوتا تھا بڑی بڑی وادیاں کھیتوں سے آباد تھیں۔

اطراف خیبر فتنہ زائیکوں میں۔

افغانستان کے پچھلے حوادث پر جب نظر کیجئے تو آپ کو یقین آجائے گا کہ خیبر کے اطراف ہی دراصل اس کے ہر فتنہ کی جڑ ہیں ان اطراف کے قبائل خواہ ہندوستان ہو یا افغانستان جہاں موقع ہو وہ لوٹ مار کے لئے آمادہ رہتے ہیں اور یہیں سے بناوٹیں اٹھتی ہیں، کبھی آپ نے غزنی اور قندھار کے اطراف میں کسی بغاوت کا قصہ نہیں سنا ہوگا حالانکہ اگر لڑائی آپڑے تو اس میں ادھر کے پٹھان بھی کم نہیں درانی کے ہندوستانی حملوں کے سپاہی ہی تھے ہم نے پشاور سے کابل تک اور کابل سے قندھار تک افغانستان کے جو علاقے دیکھے اس سے یقین آگیا کہ اس اختلاف تبلیغ کی تہ میں ان دونوں مختلف سمتوں کی معاشی کیفیتوں کا اختلاف ہے خیبرستان تمام تر سنگستان اور پتھر ملا ہے زمین قابل زراعت بہت کم ہے اس لئے ادھر کے قبائل اپنے پیٹ کے لئے اس بات پر مجبور ہیں کہ فتنے پیدا کریں

بناو تیں اٹھائیں اور لوٹ مار کر کے پرٹ بھریں بر خلاف اس کے کابل سے قندھار تک کا علاقہ بہت سرسبز و شاداب ہے اور لوگ کھیتی باڑی اور تجارت کر کے اپنی روزی پیدا کرتے اور مشغول رہتے ہیں اس لئے طبعاً امن پسند ہیں۔

قندھار کی منزلیں۔ قلات سے قندھار تک پرانی منزلیں حسبِ قیاس تھیں۔

۱۔ قلعہ قلات سے تیر انداز تک جو ترک نام ایک ندی کے کنارہ آباد اور جہاں سے درانی قوم کا ممکن شروع ہو جاتا ہے

۲۔ قلعہ تیر انداز سے شہر مضافات اس شہر کو تیمور شاہ بن احمد شاہ ابدالی مدارالمہام قاضی فیض اللہ خاں نے آباد کیا تھا۔

۳۔ شہر صفا سے کاریز علیہ و ناک، یہ ایک چشمہ ہے۔

۴۔ کاریز علیہ دسے شہر قندھار تک۔

ان میں سے ہر منزل بارہ تیرہ چودہ اور بعض سولہ کوس کی مسافت پر آباد کی نسبت سے قائم کی گئی تھی اب ان میں سے بعض منزلیں باقی ہیں اور بعض بدل گئی ہیں شاداب قلات سے پہلی منزل قلعہ جلدگ و دوسری تیر انداز قیسری شہر صفا چوتھی بانجھا، پانچویں مومند ہے، مگر تیز رفتار موٹروں نے اب ان منزل کو منسوخ کر دیا ہے۔ صرف پیدل اور جانوروں پر سوار ہو کر چلنے والوں کے حق میں ان منازل کا حکم باقی رہ گیا ہے چنانچہ آپ دیکھیں کہ راستہ کی خرابی کے باوجود قلات سے بجے چل کر ۱۲ بجے چار گھنٹوں میں قندھار پہنچ گئے۔

قندھار میں داخلہ۔ سواد شہر کے قریب پہنچنے کے ساتھ شہر کے کچھ گنبد اور مینارے دکھائی دینے لگے اور معلوم ہونے لگا کہ ہم کسی آباد مشرقی شہر میں

داخل ہو رہے ہیں، یورپ میں جائے تو پہلے اکثر مقاموں پر آبادی کی دودکش چمنیاں دکھائی دیں گی، شہر سے پہلے ایک بڑا میدان جس کے ایک طرف بنگلہ کچھ فوجی عمارتیں تھیں نظر آیا، یہ میدان بھی کسی فوجی غرض کے لئے معلوم ہوا تھا شاید ہوائی جہازات اور فوج کی چاند ماری کی جگہ ہو اس کے بعد اصل شہر آیا اللہ! اللہ! یہ شہر تو افغانستان کے تمام گزشتہ شہروں سے بڑا تمدن پر رونق اور کاروباری ہے کشادہ سڑکیں با ترتیب دکانیں مسقف اور گنبد والی عمارتیں مناروں اور گنبدوں والی مسجدیں۔

پہلے موٹریں ایک بازار سے گزر کر ایک بڑے گنبد و اسچو راہہ پر پہنچیں اس گنبد کے چاروں طرف سڑکیں اور ہر سڑک پر بازار تھا اس کی کیفیت شہر حیدر آباد وکن کے چارمینار کی سمجھئے بجز اس کے کہ چارمینار کے اندر ہو کر راستے نہیں جلتے اور اس کے اندر ہو کر سب راستے جلتے ہیں پہلے موٹروں نے اس سڑک سے جانا چاہا جو سرکاری عمارتوں کی طرف جاتی ہے اور جس کا نام شاہ بازار ہے غالباً اسی لئے کہ وہ شاہی عمارتوں کی طرف جاتی ہے مگر معلوم ہوا کہ وہ سڑک مرمت کے لئے بند ہے اس لئے دوسری سڑک سے ہو کر شہر کے باہر کی سڑک سے عمارتوں کی پشت کی طرف سے ہم ارک یعنی قلعہ شاہی میں پہنچے اور یہیں ایک عایشانہ اور وسیع عمارت کی دوسری منزل پر قیام ہوا۔

قندھار کا ارک۔ قندھار کی شاہی قیام گاہ کی یہ عمارت تمام پچھلے شہروں کی عمارتوں سے وسیع، بلند، خوشنما، با آسائش اور پر تکلف ہے، ایسا معلوم ہوا کہ جب یہ دار الحکومت تھا تو یہ ایوان شاہی تھا شہر کا قلعہ جس میں یہ ارک

واقع ہے بدستور کچی مٹی کا بنا ہوا ہے مگر اس کا عرض اس قدر ہے کہ دو تین سوار اس پر چل سکتے ہیں جا بجا گوشوں پر برجیاں بنی ہیں ایک دو جگہ نالیوں میں ٹاؤں کے بہاؤ سے دیواریں کچھ کچھ کٹ گئی ہیں دیواریں اتنی صاف اور چکنی ہیں کہ کسی مصالحہ کا دھوکہ ہوتا ہے۔

اسی آرک کے اندر تمام سرکاری عمارتیں ہیں اور سب کے آخر میں دو منزلہ عمارت ہے جو ہماری قیامگاہ ہے اسی پر اس آرک کی عمارت کا خاتمہ ہوتا ہے اس کے شمالی رخ پر بلند دیواروں کے اوپر دوسری منزل پہلے اس دوسری منزل کے شمالی رخ بڑے بڑے اونچے ستونوں پر چھت ہے اور اس کے اوپر افغانستان کا شاہی جھنڈا لہرا رہا ہے یہ رخ اسی شاہ بازار کی طرف ہے جس کا نام پہلے آیا، آرک کی دیوار کے نیچے اس رخ پہلے ایک وسیع میدان ہے جس کو اب باغ عمومی (پبلک گارڈن) بنایا جا رہا ہے داہنے بائیں دو باغ لگ رہے ہیں ان دونوں کے بیچ سے چوڑی سڑک نکل کر سیدھی شاہ بازار کی سڑک میں جا کر مل جاتی ہے پھر دوسری آرک کے نیچے سے دونوں باغوں کے چھبے سے ہلالی شکل میں نکل کر شاہ بازار کی سڑک میں ملائی گئی ہیں اور ان ہلالی سڑکوں کے کنارے کنارے ادھر سے ایک قطار میں مسلسل ہنم شکل دکانیں بنائی گئی ہیں، جن میں بعض آباد ہیں بعض کی تعمیر نامکمل ہے۔

آرک کے اندر۔ ہماری قیامگاہ کے جنوب رخ گھرا ہوا ایک صحن ہے جس پر چمن بندی ہے بیچ میں فوارہ ہے اور اس صحن کے دوسری طرف جنوب میں بالمقابل دوسری عمارت ہے یعنی یہ صحن ان دونوں کے بیچ میں ہے اس صحن سے

ہو کر باہر کا صدر دروازہ یا پھاٹک مغربی رخ کو واقع ہے، پھاٹک سے داخل ہوں تو صحن میں آئیے صحن کے شمالی اور جنوبی سمتوں میں مذکورہ بالا دو عمارتیں ہیں ہماری قیامگاہ شمالی عمارت ہے ادھر آپ کو زینہ ملے گا زینہ پر چڑھیے تو ارک کی اُس چھت پر آگئے جہاں ہم ٹہرے ہیں اوپر نیچے اور مضبوط ستونوں پر شمال کے رخ شاہ بازار اور باغ عمومی کی سمت کا کھلا منظر ہے یہ گویا سائبان ہے جو ہلالی صورت یا نصف دائرہ کی شکل میں ہے، سائبان سے اندر داخل ہو جائیے پہلے دو درجوں کا وسیع ہال ملے گا پہلے پہلا درجہ آئے گا یہ شاہ دربار شاہی کے منظرین کی جگہ ہوگی بالفعل یہ اس عمارت کا ڈائمنگ ہال (کھانے کا کمرہ) تھا یہاں کھانے کی میزیں کبھی تھیں کمرہ کی پوری زمین میں دلالتی ساخت کا ایک قالین بچھا تھا ہال کے دوسرے درجہ میں بابا کوچ اور مختلف شکلوں میں عمدہ میزوں کے گرد صاف ستھری کرسیاں کبھی تھیں اس ہال کے دونوں مغربی و مشرقی رخ پر سونے کے متعدد کمرے تھے ہر کمرہ سامان فرنیچر اور یورپین ساخت کی بوسے کی کمائی دار اونچی مسہر نو آراستہ تھا زمین میں قالین بچھا تھا مسہریوں پر صاف اُبلے پر دے لٹک رہے تھے مشرقی رخ بدھ خاص میرا کمرہ تھا ایک اور مستطیل کمرہ تھا جو ہر طرف پردوں سے گھرا ہوا تھا وہاں ایک لمبی سبز بات کی میز بھی تھی اور اس میں لکھنے پڑھنے کا سامان اور ٹیلیفون تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ خاص الخاص استعمال کے لئے ہے۔

بڑے ہال کی دیواروں پر افغانستان اور قندھار کے مختلف سلاطین

اور امراء کے فوٹو درباروں کے عکس اور جشنوں کے مرقعے آدیزاں تھے جن میں
امان اللہ خاں کے عہد کی تصویریں بھی تھیں۔

گندھار۔ قندھار بھی دنیا کے پرانے شہروں میں ہے، ہندوؤں کی پرانی کتاب
میں اس کو گندھار کہا گیا ہے، اس نام کا شہر جنوبی ہند میں بھی ہے، قندھا
غلزئی پٹھانوں کا خاص مرکز ہے اور پشتو زبان بولنے والی قوموں کی خاص
آبادی ہے۔

پٹھان اور راجپوت، میرا ایک پرانا نظریہ جو اب تک مزید دلائل کا
تشنہ ہے، یہ ہے کہ ہندوستان کے راجپوت اور افغانستان کے پٹھان دونوں
ایک قوم ہیں ان میں سے جو ہندوستان آکر ہندوؤں میں شامل ہو گیا اس
راجپوت نام پایا اور جو ادھر رہ گئے اور بعد کو اسلام سے مشرف ہوئے وہ
پٹھان کہنے گئے یہاں کے مختلف کوہستانی دروں سے سلطان محمود اور
سلطان شہاب الدین کے پرچموں کے نیچے جو حملہ آور ہندوستان آئے
وہ ہندوستان کی تاریخ کا نیا واقعہ نہ تھا بلکہ انھیں پرانی پٹھانی مسلسل آمد
اور فوجی داخلوں میں سے ایک داخلہ تھا جو ہمیشہ ہندوستان میں ہوتے
رہتے تھے لیکن چونکہ یہ حملہ آور اب بودھ دھرم کے نہ تھے بلکہ مسلمان اور ایک
قومی و منظم حکومت کے ماتحت تھے اس لئے قدیم سے آئے ہوئے راجپوتوں
ان کو قدم قدم پر روکا۔

مورخ مسعودی جس نے سن ۳۰۰ء کے پس و پیش میں اطراف سندھ کا سفر کیا
تھا وہ قندھار کے ذکر میں لکھتا ہے۔ والقندھار يعرف ببلاذ الروہب طرۃ

جلد اول پیریں) یعنی قندھار رہبوط (۹) کے ملک کے نام سے معروف ہے۔ میں رہبوط کو رچیوت (راچیوت) سمجھتا ہوں اس نے غالباً سندھ میں قندھار کے چھانو کا نام ”رچیوت سنا ہوگا“

قندھار سندھ کے خاتمہ پر ہے دوسری طرف اگر پہاڑ حائل نہ ہوں تو بول (صوبہ سرحد) اور قندھار میں بہت کم مسافت رہ جائے اس کے بعد وادی سندھ اور دریائے سندھ سامنے آجاتے ہیں غالباً یہی وجہ ہے کہ قندھار کے حکمرانوں نے سندھ پر بارہا قبضہ کیا ہے۔

موجودہ قندھار۔ شہر قندھار گو پرانا شہر ہے مگر ہماری دہلی کی طرح وسیع و فراخ وادی کے گوشوں میں مختلف حکمرانوں اور فاتحوں کے عہد میں اپنی نئی نئی جگہ بدلتا رہا ہے گویا یہ وہ کُرے ہیں جو اپنی جگہ قائم بھی ہیں اور حرکت دوری بھی کر رہے ہیں سب سے اخیر زمانہ میں قندھار کی بربادی احمد شاہ درانی کے ہاتھوں ہوئی جس نے قندھار کے شہر اور قلعہ کو برباد کر کے نیا شہر آباد کیا، اور اب موجودہ قندھار درحقیقت یہی احمد شاہی قندھار ہے احمد شاہ اور اس کے جانشینوں کا یہ دار الحکومت رہا، اس زمانہ میں افغانستان کی حکومت میں بلوچستان سندھ صوبہ سرحد پنجاب کے کچھ اضلاع اور کشمیر داخل تھے احمد شاہ نے ہندوستان پر جو فوج کشیاں کیں اور مرہٹوں کے خلاف جو فاتحانہ جنگ کی ان کام کو یہی شہر قندھار تھا۔

موجودہ شہر قندھار کی تصویر آج بھی وہی ہے جو آج سے سو برس پیشتر تھی یا علی احمد شاہ درانی کا مصنف ۱۷۷۱ء میں اس کا نقشہ یہ کھینچتا ہے۔

”مگر دوشہر پادشاہ مدوح قلعہ بچتہ وجوہا کے آبریز زیر ہر بازار دوکانہا جا کر
 دکنار جوہا سایہ درختان توت و بازارش چار سو دو درمیانف گنبد سے بلند بنا ساختہ (مست)
 ارک شاہی میں قیام۔ ارک میں پہنچ کر کچھ دیر آرام کر کے میں نے اور بعض دوسرے
 صاحبوں نے غسل سفر کیا کہ اب ہندوستان کی صرف ایک آخری منزل باقی ہے تعجب
 کی بات ہے کہ اتنے بڑے شاہی محل میں بھی مکان کے دو ضروری کمرے (غسل خانہ و بیت)
 اس کی حیثیت سے بہت ادنیٰ اور سہمی، بلکہ تکلیف دہ تھے بات یہ ہے کہ قدیم تمدن
 میں غسل خانے رہنے کے مکانات سے الگ حمام کی صورت میں مستقل بنائے جاتے تھے
 چنانچہ یہاں بھی نیچے حمام الگ موجود تھا جس میں ٹھنڈا اور گرم پانی الگ الگ
 اور نہانے کے دوسرے ضروری سامان موجود تھے بعض صاحبوں نے وہاں جا کر غسل کیا
 لیکن میں نے اسی ارک کے مختصر غسل خانہ میں حمام سے گرم پانی منگو کر غسل کیا یہاں کا موسم
 ملتان کے موسم کے قریب قریب تھا، نہانے میں بہت لطف آیا اور کپڑے بھی اب
 ہندوستان کے موسم والے پہنے۔

پشتو تحریک۔ ہم لوگوں کے پہنچنے کے بعد شہر کے کچھ ممتاز اصحاب ملنے آئے جن میں
 قابل ذکر دو صاحب ہیں وزارت خارجہ افغانستان کے نمایندہ ستینہ قندھار اور ہا
 انجمن ادبی کے ناظم اور پشتو رسالہ طلوع افغان کے ایڈیٹر عبدالحی خاں وزارت خارجہ
 کے یہ نمایندہ پہلے ترکی کی افغان سفارت میں کسی عہدہ پر رہ چکے ہیں اور اب یہاں متعین
 ہیں عبدالحی خاں ہندوستان میں شاید سندھ اور بندر کراچی میں کچھ دنوں مقیم رہے ہیں
 اردو خاصی جانتے ہیں وہ اس تحریک کے کہ افغانوں کی قومی زبان پشتو کو ترقی دیکر یہاں کی
 تعلیمی و علمی و سرکاری زبان بنائی جائے علمبردار ہیں انھوں نے آنے کیساتھ ڈاکٹر اقبال

اسی موضوع پر گھنگو شروع کی ڈاکٹر صاحب نے جواب میں زبانوں کی نشوونما اور ترقی پر اصولی بحث فرمائی اور اس بات پر زور دیا کہ زبان ایک قوم کے مختلف افراد کی باہم پیوستگی کا سب سے ضروری اور موثر ذریعہ ہے لیکن اگر اس تحریر سے قوم کے افراد میں اتحاد کے بجائے اختلاف رونما ہونے کا اندیشہ ہو تو وہ پیوستگی کا پیغام ہونے کی جگہ نزاعات اور اختلافات کا نژاد جنگ ہے جس سے افغان قوم کو موجودہ منزل میں بہت کچھ بچنا ہے۔

میرا خیال ہے کہ آج کل تنگ قومیت غلط نیشنلزم کا جو بھوت قوموں کے سروں پر سوار ہے اس کے اثر سے نوجوان افغانوں کے دل و دماغ کا بھی متاثر ہونا ضروری ہے فارسی گو ایک ہزار سال سے اس ملک کی علمی و ادبی و سرکاری زبان ہے تاہم اس دہائی کے عوام کی مادری زبان اب تک پشتو ہی ہے اس لئے عجیب نہیں کہ اس پشتو تحریر کو آئندہ مزید تقویت پہنچے اور ایک دن وہ افغانی قوم کی سرکاری زبان کا درجہ حاصل کرے۔

گورنر قندھار اور دیگر عہدہ دار

ابھی ہم لوگ جنگو افغانوں کی ”زبانی جنگ“ میں مصروف تھے کہ قندھار کے گورنر اپنے کشوری (سولی) اور لشکری (ملٹری) اسٹاف کے ساتھ تشریف لے آئے وہ ملیہ راجہ میں مبتلا تھے اور بخار کے اترنے کے بعد بھی اس کا ضعف باقی تھا اور اسی لئے شہر سے کئی میل دور کئی فرحت افزا مقام میں تھے مگر صرف ہم لوگوں سے ملنے کی خاطر انھوں نے علالت اور ضعف کے باوجود یہاں آنے کی تکلیف گوارا کی سردار موصوف نے ہم سب سے سلام و مصافحہ کے بعد اسٹاف کے ایک ایک عہدہ دار کا

تعارف کرایا یہاں کے بلدیہ (میونسپلٹی) کے صدر بھی اسٹاف کے ساتھ تھے دیر تک مختلف امور پر باتیں ہوئیں آخر چار بجے کے قریب ملنے والے مہمانوں نے خلعت چاہی ہم لوگ بھی ساتھ ہی قندھار کی سیر کے لئے اٹھے۔

سردار موصوف نہایت متین سنجیدہ اور ملنسار معلوم ہوئے یہ بھی موجودہ حکمران خاندان سے تعلق رکھتے ہیں خیال آتا ہے کہ شاہ نادر خاں مرحوم کے بھانجے ہیں ارک کے صدر دروازہ تک ہم لوگ ساتھ چلے سردار موصوف قریب کے مقامات تک ہمراہ چلنا چاہتے تھے مگر ان کے ضعف کے سبب ان کو خلعت کھانا اور وہ اپنی خوبصورت اور شاندار کار پر سوار ہو کر واپس گئے۔

خرقہ شریف کی زیارت گاہ اور احمد شاہ درانی کا مقبرہ قریب تھا اس لئے ہم لوگ پیدل روانہ ہوئے اور موٹروں کو مقبرہ کے دروازہ پر لیجانے کا حکم دیا گیا۔ خرقہ شریف۔ ارک سے نکل کر سب سے پہلے خرقہ شریف کی عمارت ملتی ہے مشہور ہے کہ یہاں آنحضرت صلیعہ علیہ وسلم کا ملبوس اقدس ہے اس کی قدیم تاریخ کا کوئی پتہ نہیں چلتا احمد شاہ ابدالی کو یہ تبرک شاید بنجارا سے ہاتھ آیا تھا وہ بڑے ادب و احترام سے اس کو اپنے دارالسلطنت میں لایا اور قصر شاہی کے پاس ہی اس کے لئے مسکن میں ایک عمارت بنوائی عربی میں یہ تاریخ بالف و ہائتہ و ثمانین و اثنین مرقوم ہے عمارت کی موجودہ شکل ایک بہت بڑے گنبد کی ہے جس کے نیچے ایک گول کوٹھری ہے جس کی چھت وہی گنبد ہے سامنے دروازہ سے گنبد کے اندر داخل ہوتے ہیں جس وقت ہم لوگ پہنچے ہیں اس دروازہ میں فرش بچھا تھا لیکن واپسی کے بعد ہم نے دیکھا کہ اس کو

سپاہیوں نے لپیٹ دیا جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ فرش خاص خاص
موقعوں پر بچھتا ہے۔

موجودہ گنبد کی عمارت امیر حبیب اللہ خاں شہید مرحوم کی بنوائی
ہوئی ہے دروازہ کے داہنے بائیں بلندی پر چلی خوشخط حروف میں لکھا ہے
امیر حبیب اللہ خاں کے زمانہ میں سردار محمد عثمان خاں نائب لار نائب الحکومت
قدحار نے ۱۲۹۰ھ میں اس کو بنوایا دروازہ سے داخل ہو کر گنبد کے اندر
قدم رکھا دیوار کی سطح خوشنما اور زرین نقش و نگار سے آراستہ تھی گنبد کے اوپر
پورے دور میں کوئی خوشخط کتبہ تھا یہ گنبد خالی تھا اس کے مغربی رخ پر
ایک اونچا چبوترہ تھا اور اس کے پہلو سے اوپر چبوترہ پر چڑھنے کا زینہ تھا
زینہ کے اوپر خوبصورت کٹہرہ تھا اس زینہ کی راہ سے ہم اوپر چڑھے وہاں
ایک غلاف کے اندر وہ خرقہ شریف پٹا تھا اوپر ایک شامیانہ تنہا تھا
سامنے خوشبو کے لئے بخور دان وغیرہ تھے درود و سلام کے ساتھ وہاں اُٹھا ہوا
اور پھر اسی احترام کے ساتھ واپسی ہوئی۔

اس قسم کے تبرکات کی نسبت میرا خیال یہ ہے کہ گوان کی تاریخی
حیثیت ہم پر واضح نہیں اور نہ اس نسبت کی صحت پر دیلیں ظاہر ہیں
لیکن پھر بھی جمہور کثیر اس نسبت کی صحت کا قائل ہے اس بنا پر اس کے
انکار کی بھی کوئی صاف قوی دلیل ہمارے پاس نہیں اس لئے اگر ہم نبوی
کا پاس ادب کریں تو شاید یہ آئین محبت کے مطابق ہوتا ہم ظاہر
ہے کہ اس محبت کے آثار و کیفیات مشرکانہ رسوم اور مشرکانہ طریق ادب

صورت میں ظاہر نہ ہونے چاہئیں۔

احمد شاہ ابدالی کا مقبرہ

یہ وہی احمد شاہ ابدالی ورانی ہے جس کا نام ہندوستان کے آخری تاریخی اور اراق میں بار بار آتا ہے اور جس نے اپنے متواتر چھ حملوں کے ہندوستان کی بد امنی کو دور کرنا چاہا اور سب سے آخری دفعہ آکر شمالی ہندوستان سے مرہٹہ تخت و تاراج کا خاتمہ کر دیا۔

احمد شاہ کا خاندان صدوزئی قبیلہ سے ہے مشہور ہے کہ اس کے مورثوں میں سے ایک بزرگ کا نام ترین تھا اس نے خواجہ ابوالاحمد ابدال چشتی سے مرید ہو کر ابدال لقب پایا اور اسی نسبت سے احمد شاہ ابدالی کہلایا ترین ابدال کی اولاد میں سے ایک کا نام صدو تھا جس سے صدوزئی قبیلہ کا وجود ہوا، صدو کے ایک لڑکے کا نام خضر تھا، خانوادہ چشت کی ارادت و بیعت نے اس خاندان میں بزرگی کی شان پیدا کی خضر نے اپنی دینداری اور تقدس کی بنا پر خواجہ خضر کا لقب پایا اور افغانوں کی ارادت و عقیدت نے اس کو مرکز حیثیت عطا کی احمد شاہ اسی مقدس دادا کا خوش قسمت پوتا تھا، نادر شاہ کے بعد افغانوں نے احمد شاہ کو اپنا بادشاہ منتخب کیا اور قندھار اس کا دار السلطنت قرار پایا اس وقت اس بادشاہ کے دائرہ حکومت میں افغانستان کے علاوہ کشمیر صوبہ سرحد پنجاب اور سندھ کے علاقے داخل تھے جن کو اس کے بعد کے جانشینوں نے رفتہ رفتہ اپنے ہاتھوں سے کھو دیا۔

سلطان احمد شاہ ابدالی دیندار انصاف پسند اور پر جوش مجاہد تھا او

یہ کہنا مبالغہ سے خالی ہے کہ اسلام کی پچھلی تاریخ میں اس سے بڑا کوئی دوسرا
ہیرو نہیں میسٹیں برس کی سلطنت کے بعد ۱۱۸۶ء میں وفات پائی اور قندھا
میں ارک شاہی کے پاس دفن ہوا اس کے بعد اس کے بڑے بیٹے تیمور شاہ نے
تحت شاہی پر قدم رکھا اور اپنے باپ کی قبر پر یہ عظیم الشان مقبرہ تعمیر کرایا
انھوں میں اس مقبرہ کا اس قدر ادب و احترام تھا کہ غنی مجرم بھی اگر گھبرا
کر اس میں پناہ دیتا تو امان پاتا۔

مقبرہ اینٹ اور چونہ کا بنا ہے، اوپر بہت بڑا ہشت پہل گنبد ہے
جس کے نیچے بادشاہ کی قبر ہے گنبد کی بیرونی دیواروں پر چینی کا کام ہے جو اب
خراب ہو چکا ہے گنبد کے اندر کی سطح طلائی اور رنگ آمیزی کے نقش و نگار سے
آراستہ ہے گنبد کے اندر زمین پر کوئی فرش نہ تھا گنبد کے اوپر جہاں دیواریں
ختم ہوتی ہیں چاروں طرف خوشخط جلی حروف میں حسب ذیل اشار لکھے ہوئے ہیں
شاہ والا جاہ احمد شاہ درانی کہ بود در قوانین امور سلطنت کسریٰ منش
از نہیب قہر بان سطوتش در عہد او شیر آہور ابشیر خویش دادے پرورش
می رسید از ہر طرف در گوش بدخواہان از زبان خنجرش ہر دم ہزاروں ہزارش
چوں داں شد جانبدار البقا تاریخ بود سال ہجری یک ہزار و یکصد و شادوش
مقبرہ کے اندر قدم رکھنے کے ساتھ اس بادشاہ کشورتاں کی وہ تصویر
سامنے آگئی جو ہندوستان کی انگریزی تاریخوں میں بنی ہوئی نظر آتی ہے اس کے
کارناموں کی عظمت نے اپنے زائرین کو باادب بنا دیا جو چیز منی کے ڈھیر کے
نیچے تھی وہ چند بیان ہڈیوں کے سوا کچھ نہیں مگر اس کی زندگی کا ایک ایک

حرف آبِ حیات کی سیاہی سے جریدہ عالم پر ثبت ہے۔

قرآن پاک کا شاہی نسخہ

مقبرہ میں سلطان کے سرھانے بلندی پر اس کا در قرآن رکھا تھا جو خاص اس کی تلاوت کا تھا مقبرہ کے خادم نے اس قرآن کو جزو دان کمال کر ہمارے سامنے رکھا یہ چوب خط مترجم و محشی قلمی قرآن تھا جس کی تیاری خاص اہتمام کے ساتھ عمل میں آئی تھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ بادشاہ کی اخیر عمر میں اس کی پیری اور ضعفِ بصارت کی بنا پر موٹے حروف میں لکھوایا گیا تاکہ بادشاہ سہولت کے ساتھ اس کو پڑھ سکے یہ نسخہ دو ہاتھ کے قریب لمبا ہے خط نہایت عمدہ اور بہت جلی ہے نیچے فارسی ترجمہ اور حاشیہ پر خط تعلیق فارسی کی تفسیریں ہیں اور آخر میں فارسی نظم میں ایک فاننا مہ ہے اور سب سے آخر میں جن لوگوں نے اس نسخہ کو بادشاہ کے لئے تیار کیا تھا ان کے نام ہیں عبارت کا اقتباس یہ ہے۔

..... سلطان احمد شاہ بادشاہ غازی درانی خداوند ملکہ دم شہر ربیع الثانی
 باہتمام بندہ درگاہ اضعف عباد اللہ علی اکبر خاں ادوکر ہی حافظ عبدالوہاب بن نوشت
 و محمد ہاشم و محمد تقی و عبدالعزیز و تھانیہ و محمد یوسف ترجمہ نوشت و بہ کار صحافی عبدالمکرم

صحاف صورت اتمام پذیرفت

میں نے کہا یہ قرآن کا وہ نسخہ ہے جو اس تیغ آزمائش و کشافِ فتح ہند حکمران بادشاہ کے دل پر حکمرانی کرتا تھا۔

عبارت بالا میں نسخہ مذکور کی تیاری کی جو تاریخ (۱۱۷۱ھ) درج ہے اس

علوم ہوتا ہے کہ یہ شاہِ مغفور کی وفات سے آٹھ برس پہلے تیار ہوا تھا۔
 ارغنداب۔ مقبرہ سے نکل کر شرک پر آئے تو موٹریں کھڑی تھیں ہم لوگ دو
 ٹروں پر سوار ہوئے، مامور صاحب ذرا دقت خارجہ جواب تک ہمارے ساتھ
 نے آئینہ کی سیر میں بھی ہمارے ہمراہ ہوئے قندھار کا سب سے خوبصورت
 لٹل طبعی منظر کا نام ارغنداب ہے مقبرہ سے نکل کر ہم اس کے دیکھنے کو روانہ ہوئے
 جہود شہر کی چار دیواری سے باہر بھی ہر طرف عمدہ شریکیں تھیں سامنے پہاڑی کی
 ندی نظر آتی تھی نیچے ایک نہایت وسیع میدان تھا، مامور صاحب (افغانستان
 موجودہ سلطنتی اصطلاح میں "ماسور" کے معنی ماتحت افسر کے ہیں) نے بتایا کہ پہلے پڑا
 قندھار یہیں آباد تھا مگر اس وقت یہاں اس میدان میں گذشتہ آبادی کا کوئی
 شان موجود نہیں۔

اس میدان کو طے کر کے ہم مذکورہ بالا پہاڑی کے قریب پہنچے اس پر
 ایک نہایت عمدہ دُھلوان شرک بنی ہوئی تھی موٹروں نے آہستہ آہستہ بلندی
 پڑھنا شروع کیا یہاں تک کہ ہم پہاڑی پر چڑھ گئے اور تنگ راستہ سے ہوتے
 ہوئے ایک ایسے بلند لیکن تنگ تر مقام پر پہنچ گئے جہاں سے موٹروں کا لگے
 رخصا نامکن تھا یہاں سے اتر کر پیدل چلے اور فوراً ایک کشادہ مقام پر آ گئے
 بس کے پچاس ساٹھ فیٹ نیچے زمین کی سطح تھی یہ عجیب و غریب منظر تھا
 قندھار کی سب سے بڑی بلندی پر ہم اس وقت کھڑے تھے نیچے میدان میں
 دریائے ارغنداب بہہ رہا تھا اور اس کے بعد تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر
 دو اور ندیاں بہہ رہی تھیں، الغرض نیچے تین تین ندیاں یا فطری نہریں آہستہ

مصرفِ خرام تھیں اور ان مادیوں یا بہروں کے کناروں کے برابر برابر تیس میل
مکمل انار اور دوسرے میوؤں کے باغ در باغ کا سلسلہ نظر کے سامنے تھا ایسا
دھچپ فطری منظر میری آنکھوں نے اب تک نہیں دیکھا تھا جدھر نظر اٹھتی تھی
جنتِ تجری من تحتہا الا نہار کا سماں دکھتی تھی۔

بابا کا فرار۔ اللہ واپس کی کیا بات ہے؟ یہ مخلوق کے ازدحام سے بھاگ کر جب
کسی گمنام گوشہ کو ڈھونڈتے تھے تو عموماً ان کی نگاہِ انتخاب قدرت کے کسی
نہ کسی سادہ مگر دھچپ منظر پر جا کر پڑتی تھی اکثر بزرگوں کی چلہ کشی اور عبادت کی
جگہیں اسی قسم کے مقامات ہیں پورٹ سوڈان کو اب جا کر انگریزوں نے آباد کیا
اور بندرگاہ بنایا ہے مگر حیرت ہوتی ہے کہ ایک بزرگ نے خدا جانے اس سے
کتنا زمانہ پہلے اس کو اپنے عبادت خانہ اور مدفن کے لئے پسند کیا چنانچہ بھرا حرم
آفریقی ساحل پر پورٹ سوڈان کے قریب ان کا فرار ہے ارغنداب کا یہ
دھچپ نظارہ کب کسی نظارہ قدرت کے طالب سبچ سکتا تھا ایک بزرگ
نے جو بابا ولی کہلاتے ہیں اس مقام کو پسند کیا ان کا فرار اس بلندی پر واقع
اور اس کے قریب ایک چھوٹی سی مسجد کا کھلا دالان ہے سال میں ایک دفعہ
یہاں میلہ لگتا ہے اور دینے قربانی ہوتے ہیں شہر کے خوش مذاق دوستوں کے ساتھ
سیر و تفریح کے لئے یہاں اکثر آتے ہیں اور کھانا پکاتے اور کھاتے ہیں۔

یہاں سے واپسی میں مامور صاحب نے شرک سے ایک اونچی پہاڑی
دکھائی جس کی تدرتی شکل ایسی تھی جیسے معلوم ہوتا ہو کہ ایک بہت بڑا ہاتھ
سینکڑوں گز لمبا سامنے بیٹھا ہے۔

بجلی گھر۔ دریائے ارغنداب کی روانی سے علاوہ باغوں کی سیرابی کے موجود
حکومت نے جدید سائنٹیفک فائدہ اٹھانا چاہا ہے چنانچہ ان دریاؤں کے بہاؤ
سے جو بجلی پیدا ہوتی ہے اس کے لئے اسی کے قریب ایک بجلی گھر بنایا ہے
بجلی کے چند ماہرین اس میں کام کرتے ہیں بجلی کے ستون سڑکوں پر قائم کئے
جا چکے ہیں اور تار بھی پھیلائے جا چکے ہیں مگر ابھی تک بیہی کے محاورہ میں
کارخانہ ”چالو“ نہیں ہو سکا امید ہے کہ اتنے عرصہ میں یہ کارخانہ شہر کے
گھروں اور سڑکوں کو پر نور بنا چکا ہوگا۔

چہل زینہ۔ اس پہاڑی سے اتر کر ہم قندھار کے باہر کی دوسری سمت
میں چلے اور ایک پہاڑی کے پاس پہنچے شہنشاہ بابر نے اس پہاڑی کے
اوپر اپنے ہندی فتوحات کا کتبہ لگایا ہے اس پہاڑی کے دامن میں پہنچ کر
ہم موٹروں سے اترے حکومت نے اس پہاڑی تک سڑک بنا دی ہے
دامن سے پہاڑی تک پتھر کاٹ کر زینے بنائے گئے ہیں ہمراہیوں میں سے
میرے اور پروفیسر ہادی صاحب کے سوا کسی اور نے اوپر چڑھنے کا شوق
نہیں کیا کہنے کو تو یہ چالیس زینے ہیں مگر دراصل تعداد میں چھیالیس ہیں
حکومت نے زینہ کے دونوں طرف لوہے کے کھڑے لگا دیئے ہیں تاکہ
چڑھنا اترنا آسان اور محفوظ ہو یہ سیڑھیاں پہاڑ کو کاٹ کر بنائی گئی ہیں
جو زیادہ صفائی کے ساتھ نہیں بنی ہیں ہم نے ہمت کر کے ان سیڑھیوں پر
چڑھنا شروع کیا گو اب تھوڑی محنت سے بھی دم پھول کر سینہ میں درد محسوس
ہونے لگتا ہے تاہم میں نے ہمت نہیں ہاری اور اوپر تک چڑھ گیا اوپر

پہاڑ کی سطح کو کھود کر مسجد میں امام کے سامنے والی محراب کی طرح ایک محراب بنائی گئی ہے جس کے بیچ میں ایک طاق ہے اور اس میں شہنشاہ بابر کے حکم سے چلی خط میں ہندوستان کے ان شہروں کے نام بہ ترتیب وقوع جغرافیہ کندہ کئے گئے ہیں جن کو اس نے بزور بازو فتح کیا تھا اور اوپر بادشاہ کا نام لکھا ہے پورب کے شہروں میں سے پٹنہ، حاجی پور، ترہست، سہسرام سے لیکر لکھنؤ اور وہاں سے لاہور تک کے شہروں کے نام ہیں دن آخر ہو چکا تھا اس لئے ان ناموں کو نقل نہ کر سکا واپسی کی جلدی تھی مجوزہ جدید شہر قندھار۔ موجودہ شہر سے باہر اور چہل زینہ سے قریب ہم نے بعض نئی سڑکیں رویشیں اور ایک نئے شہر کی طرح ڈالنے کے نشان دیکھے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ امیر امان اللہ خاں یہاں جدید اصول پر نئے شہر قندھار کی بنیاد ڈالنی چاہتے تھے مگر زمانہ نے وفانہ کی۔

فوجی میدان۔ ارغنداب سے واپسی میں اور چہل زینہ کو آتے ہوئے ایک میدان ملا تھا جس میں افغانی فوج، ورزشی کرتبوں، فوجی کھیلوں اور قومی رقص میں مصروف نظر آئی۔

شہر کی کیفیت۔ اس شہر کی سڑکیں عموماً اچھی نظر آئیں، بیرون شہر کی سڑکیں بھی صاف اور ہموار بنی ہوئی تھیں اور سب سے بڑھ کر اس کی سرسبزی و شادابی کا منظر ہے ہر طرف میدان بچھے ساتھ ہی ساتھ نہروں کی کیفیت یہ ہے کہ جدھر نگاہ اٹھائے پانی کی ہلکی سی لکیر دوڑتی ہوئی نظر آتی ہے، عموماً سڑک کے ساتھ اس کے پہلو بہ پہلو پتلی سی نہریں ہر طرف رواں ہیں باہر سے

آنے والی سڑک اور شاہ بازار کی سڑک میں یہ کیفیت خاص طور سے نمایاں ہے۔ اسلامی شہر کا منظر۔ چیل زینہ سے واپسی میں مغرب کا دقت ہو گیا تھا اور اسلامیت کا یہ کس درجہ پر اثر منظر تھا کہ ہر راہرو ہر مسافر ہر دکان دار جس کو جہاں موقع تھا اس نہرواں پر بیٹھ کر وضو کر رہا تھا اور چادر بچھا بچھا کر اگر جماعت کی صورت نہ تھی تو تنہا کھڑا رو بقبلہ نماز ادا کر رہا تھا بیچ بیچ میں ایسے چبوترے بھی ملے جن پر نماز باجماعت ادا ہو رہی تھی آباد مسجدیں بھی نہیں بازار پر گزر ہوا تو دیکھا کہ دکاندار سے لے کر خریدار تک نہرو پر وضو کر رہا تھا یا مصروف نماز تھا کوئی اپنی دوکان ہی پر اور کوئی دکان سے نیچے کپڑا بچھا کر کھڑا تھا یہ روح پرور نظارہ قندھار کے بسوا اس ملک میں مجھ کو اور کہیں نظر نہیں آیا۔

شہر کی روشنی۔ شاہ بازار کی سڑک اب کھل گئی تھی اسی راہ سے واپس ہو کر ارک پہنچا اور نماز مغرب ادا کی اب رات کی آمد آمد تھی تمام بازاروں میں پوری روشنی تھی۔ یہاں دکانیں جلد بند ہوتی ہیں شاہ بازار کی دکانیں البتہ شام کے بعد بھی کھلی رہتی ہیں اور ان میں روشنی معلوم ہوتی ہے ارک شاہی کے اس رخ سے جو شاہ بازار کی طرف ہے دیر تک کھڑا رہا، سڑکوں پر روشنی کے بلند ہندسے آویزاں تھے جن سے سارا بازار روشن تھا۔

باغ عمومی میں مینڈ۔ اوپر لکھا جا چکا ہے کہ ارک کا جو رخ شاہ بازار کی طرف ہے اس میں ارک اور بازار کے بیچ میں ایک باغ عمومی مینی پبلک گارڈن ہے اس وقت اس باغ عمومی میں ”جنت بگاہ کے ساتھ ”فردوس گوش“ کا بھی سامان

یعنی بینڈ ماسٹر کی نگرانی میں افغانی فوجی باجہ سڑک پر باقاعدہ دور کر کے
نغمہ سرائی میں مشغول بتایا کی سڑک سے نمودار ہو کر ارک کے نیچے تک پہنچ کر
بازو کی سڑک پر گھوم جاتا تھا اور وہاں سے آہستہ آہستہ چلکر پھر بیچ کی سڑک پر
پہنچ جاتا تھا کہیں کہیں مقررہ مقامات میں ٹھہری تھوڑی دیر کھڑا بھی ہو جاتا تھا، یہ
نغمہ سرائی ایک گھنٹہ تک جاری رہی ہوگی اس کے بعد وہ اپنا مقررہ وقت
ختم کر کے ارک کے سامنے آداب بجالا کر رخصت ہو گیا۔

یہ مہمیں ملکوں کے شہروں کی پوری نقل تھی دریافت سے معلوم ہوا کہ یہ
انتظام یہاں کی مینوسٹری کی طرف سے ہے ہر روز شام کو یہاں آکر فوجی بند
بجاتا ہے۔

راس مسعود صاحب کا شبینہ سفر

ہمارے رفقاء میں سے تید راس مسعود صاحب کو واپسی کی سخت جلدی
تھی وہ چاہتے تھے کہ آج ہی شب کو یہاں سے رخصت ہو کر صبح کو چمن پہنچیں اور
چمن سے موٹر چل کر دوپہر کی گاڑی کوئٹہ میں پکڑیں اور وہاں سے ریل پر
سوار ہو کر علی گڑھ روانہ ہو جائیں لیکن مشکل یہ تھی کہ سید صاحب کی سواری کی
موٹر خراب ہو چکی تھی اور کئی دوسری موٹر کے انتظام میں وقت تھی دوسری وقت
یہ تھی کہ جب تک انگریزی قونصل خانہ قندھار کے فارم پر موٹر کے تمام ضروری
حالات و کیفیات لکھ کر اس سے اجازت نہ لے لی جائے موٹر چل نہیں سکتی تھی۔
قندھار کا برطانی قونصل خانہ۔ قندھار میں انگریزوں کا ایک قونصل خانہ
بھی ہے جو ارک شاہی سے قریب ملا ہوا ہے۔ آج کل یہاں کے قونصل ہمارے

دوست سید غلام بھیک صاحب نیزنگ کے حقیقی بھائی خاں بہادر سید صدیق صاحب ہیں موصوف عصر کے وقت ملتے بھی آئے تھے ڈاکٹر اقبال سے ان کی پرانی ملاقات اور گویا ہموطنی تھی دہلا پتلا بدن اویٹھڑ عمر کی کچی پکی دائرھی سر پر پنجابی صافہ او کوٹ ملتے میں خلیق، ملنسار اور متواضع وہ پہلے سوا حل عرب کی ریاستوں میں سے شاید بحرین ہیں انگریزی قونصل تھے اب قندھار میں ہیں ڈاکٹر ظفر الحسن صاحب جو مسلم یونیورسٹی میں فلسفہ کے پروفیسر ہیں ان سے سید موصوف کی خاص غرض داری ہے اس بنا پر سید راس مسعود صاحب نے اپنے سفر کے مشکلات کے حل کرنے میں مدد چاہی انھوں نے اس کا حل یہ پیدا کیا کہ خاص اپنی کار جس کے مذکورہ بالا قانونی مراحل پہلے سے طے تھے اور جس کا شو فر بھی راستہ کے جزئیات سے پورا واقف تھا راس مسعود صاحب کے حوالہ کر دی ان کے اسباب کے لئے جانے کے لئے افغانی لاری تیار کر دی گئی تھی بیچارہ سرور خاں گویا اور مامور صاحب اپنی ذمہ داریوں کو دیکھتے ہوئے سید صاحب کے اس شبینہ سفر کی سخت نفیخت کر رہے تھے مگر انھوں نے کسی طرح نہ مانا مجبوراً بادل نا خواستہ انحراف سے کیا چند مسلح سپاہی ساتھ کر لئے راستہ میں قلعہ نو کے محافظین کو ٹیلیفون کر دیا کہ جو موٹر اور لاری اس وقت جا رہی ہے ان کی فراحت نہ کرنی اور آگے بڑھنے دیں اور فوجی چوکیوں کے ہر انفر کو ٹیلیفون سے حکم دیا گیا کہ جب جس کی سرحد سے یہ موٹر گزرے وہ قندھار کے اعلیٰ دفتر کو اطلاع دے اس انتظام کے ساتھ سید صاحب مع پروفیسر بادی جن کے قندھار سے رخصت ہوئے ۱۲ بجے شب کو وہ یہاں سے چلے تھے اور صبح کو معلوم ہوا کہ طلوع آفتاب سے کچھ پہلے

وہ افغانی سرحد سے بخیر و خوبی گزر کر ہندوستان کی سرحد میں داخل ہو گئے۔
 شب کا قیام۔ باقی رفقائے رات بقندھا رہی میں بسر کی رات کو پوری
 ٹھنڈک تھی سب نے کھلے کمروں کے اندر مسہری کے پردوں میں چادریں
 اوڑھ کر آرام کیا میں صبح کو حسب معمول اٹھا اور صبح کے دو گانہ کے بعد
 ارک سے اتر کر پیادہ اور تنہا شہر کی طرف رخ کیا۔

سڑکوں کی سیر۔ میں ارک کے زینہ سے اتر کر باغ عمومی میں آیا۔ دونوں طرف
 پتلی سی نہریں بہہ رہی تھیں ابھی باغ کا آغاز ہے سڑکیں بھی بن رہی تھیں ارک کے
 سامنے کی دکانوں کی تعمیر بھی جو جدید طرز پر ہو رہی تھی ابھی پوری نہیں ہوئی
 تھی کنارہ کی سڑک سے ایک ایک دکان پر غور کی نظر ڈالتا ہوا شاہ بازار
 کی طرف چلا ہر دکان پر نہایت اہتمام سے فارسی زبان و خط میں سائن بورڈ
 لٹکے ہوئے تھے سب کے تختے سیاہ اور حروف سپید تھے ہر دکان کے سائن بورڈ
 پلٹے کے مالک کا نام مع پیشہ یا جنس دکان کے اظہار کے لکھا ہوا تھا مثلاً
 یعقوب علی خاں کتاب والا، احمد خاں گھٹی والا، سردار خاں شکروالا۔
 اردو کی عالمگیری۔ اردو تو جلال آباد، کابل اور غزنین ہر جگہ ملی مگر قندھار
 کی ایک خاص امتیازی شان یہ دیکھی کہ دکانوں پر سائن بورڈ کے اوپر ہر جگہ
 پیشہ یا جنس دکان کے اظہار میں اردو لفظوں کا اظہار تھا اور والا کا لفظ
 جو خالص اردو ہے ہر دکان کے سائن بورڈ پر درج تھا مثلاً فلاں خاں
 کتاب والا، گھٹی والا، شکروالا والا کی اس کثرت استعمال کو دیکھ کر بمبئی یاد
 آگئی جہاں بوٹلی والا (بوتل والا) اور اسٹیشن والا مالک سنائی دیتا ہے۔

دکانیں سویرے کھلتی ہیں۔ یہاں جس طرح دکانیں سویر بند اور سویر کھلتی تھیں وہی طرح آفتاب کے ساتھ دکانیں کھل رہی تھیں کھانے کی دکانیں جا بجا تھیں اور یہ بالکل اسی طرح کی تھیں جس طرح لکھنؤ اور دہلی میں نانباکیوں کی دکانیں ہیں یہ دیکھ کر نہایت تعجب ہوتا تھا کہ دکانوں پر خاں صاحب بیٹھے ہوئے کہیں ہلدی و صفیا بیچ رہے ہیں کہیں غلہ تول رہے ہیں کہیں کپڑے ناپ رہے ہیں۔

میں اس شرک میں اس گنبد تک گیا جس کو حیدر آباد کے چارمینار سے تیشل دے چکا ہوں راستہ میں شرک پر جا بجا دودھ و دہی ہالائی بیچنے والے بیٹھے تھے یہاں کا جادو دہی خاص طور پر نہایت عمدہ ہوتا ہے مٹی کے چھوٹے چھوٹے آنچروں میں دہا ہوا بازار میں فروخت ہوتا ہے، دودھ و دہی والے یہ آنچوٹے لئے جگہ جگہ بیٹھے تھے خصوصاً گنبد کے نیچے کی چھت میں ان دہی بیچنے والوں کا بڑا ہجوم تھا۔

دکانوں کی کیفیت۔ یہ دکانیں مقف تھیں یہاں گنبد نمایاں ہی پشت کچی چھتوں کا رواج ہے، دکانوں میں عموماً صرف ایک کمرہ یا کوٹھری نظر آتی تھیں بازار کے رخ دروازے کھلے ہوئے سامان کی حیثیت سے دکانیں بہت معمولی تھیں کپڑوں کی دکانوں میں بھی سوئی کپڑے تھے اور بہت معمولی تھے پھینٹ کے کپڑے اکثر پھیلے تھے دکانیں گوصاف تھیں مگر چونکہ اعلیٰ معیار کے عمدہ سامان و اسباب سے خالی تھیں اس لئے نمائش میں دیکھ رونی نہیں معلوم ہوتی تھیں۔

شاہ بازار کی مسجد۔ شاہ بازار کے بیچ میں ایک مسجد ملی ہے اس میں داخل ہوا

مسجد معمولی تھی مگر منبر ایک خاص پتھر کا عمدہ تھا معلوم ہوا کہ یہ پرانے زمانہ کی شاہی تعمیر ہے۔

پتھر کی صنعت۔ قندھار کی خاص چیز پتھر کی صنعت کاریاں ہیں یہاں ایک پتھر ہوتا ہے جس کا نام سنگ شاہ مقصود ہے یہ سپید، زرد اور سبز تین رنگوں کا ہوتا ہے سب سے سستا سپید پتھر زرد اور گراں اور کمیاب سبز ہے اس پتھر کی پہلے عموماً نیسیجیں بنتی تھیں اور اب اس زمانہ میں حال کی ضرورت کی دوسری چیزیں بھی بنتی ہیں مثلاً کاغذ بنانے کا پتھر، سگریٹ کی ڈبیہ، سگریٹ کا پائپ، میوہ دان اور شمع دان وغیرہ

دکاندار۔ سید اس مسعود صاحب اپنی عزیز خواتین کے لئے تحفہ کے طور پر اس پتھر کی چند نیسیجیں خریدنی چاہتے تھے مامور صاحب نے رات کے وقت چند دکانداروں کو سامان لے کر ارک میں بلوایا، ایک ایک کبس میں شہرخص اپنا سامان لے کر آیا، اور بات چیت شروع کی زبان فارسی تھی، اللہ اکبر! ہر طرح کی قسم و قرار اور اظہار ایماندار کے باوجود قیمت کے بتانے اور مول تول میں اتنی فضول گوئی ہوئی کہ بیگانہ آدمی کبھی صحیح قیمت پر چیز خرید ہی نہیں سکتا سو پچاس روپیہ قیمت کہہ کر مول شروع ہوا، اور دس بارہ روپیہ پر تمام ہوا سبز نیسیج کے دانے پندرہ روپیہ میں ملے ان کے ساتھ نیسیجوں کے گوتھے کا سامان بھی ساتھ رہتا ہے اسی وقت نیسیجیں دھاگے میں پرو کر خریدار حوالے کیں۔ اسی اور علمی ادارے۔ اتنی جلدی میں یہاں کا کوئی مدرسہ یا علمی ادارہ نہیں رہ سکا کابل کی طرح یہاں بھی ایک انجمن ادبی ہے اور اس کے چند علم دوست

ارکان ہیں انجن کے پاس مختصر سا کتب خانہ بھی ہے اس انجن میں فارسی کے بجائے پشتو زبان کو اہمیت حاصل ہے انجن کی طرف سے ایک ماہانہ نشتر رسالہ بھی نکلتا ہے ایک مختصر عجائب خانہ ہے جس کو میوزیم جدید کہتے ہیں عربی کا ایک دستہ ہے جس کا نام مدرسہ محمدیہ ہے نئی طرز کے دو سرکاری اسکول ہیں ایک کا نام مکتب شعلہ ماہ اور دوسرے کا نام مکتب تونچانہ ہے ان دونوں اسکولوں میں سے ہر ایک میں پانچ سو طالب علم ہوں گے ایک دارالاساتین بھی ہے جس میں محتاجوں کو حکومت کی طرف سے کھانا ملتا ہے خود اہل شہر اور محلہ والوں کی طرف سے بھی چند مدرسے ہیں جن میں محلہ کے لڑکے تعلیم پاتے ہیں۔

قندھار کے پھل اور میوے۔ قندھار کی تجارت کا سب سے بڑا سامان پھل اور میوے ہیں یوں تو اور بھی پھل اور میوے ہوتے ہیں مگر سب سے زیادہ شہرت یہاں کے اناروں کو حاصل ہے قندھاری انار جو ہندوستان آتے ہیں وہ تو ہمسینوں میں سوکھ کر خشک ہو جاتے ہیں وہاں کا ایک تازہ انار آدھ سیر سے کم نہ ہوتا ہوگا اور اس قدر ان میں عرق ہوتا ہے کہ آدھا گلاس عرق ان سے بخوبی نکلتا ہے۔ البتہ ان میں کسی قدر چاشنی ضرور ہوتی ہے اس لئے انار کے دانوں پر ذرا سامانک چھڑک کر کھاتے ہیں اور اس ترکیب سے ان کا ایک خاص مزہ ہو جاتا ہے ہر روز قندھار سے چین اور کوئٹہ کو ان میوؤں اور پھلوں کی پکیں تیس لاریاں آتی جاتی ہیں ان کے لئے وہاں خاص قسم کی ٹوکریاں بنتی ہیں اور ایک قسم کی لمبی لمبی گھاس چاروں طرف سے بھر کر بیچ میں پھل اور میوے رکھتے ہیں کہ راستہ میں وہ دبنے اور چور ہونے سے محفوظ رہیں۔

قلعہ جدید و چین ۲ نومبر ۱۹۳۳ء

بلدیہ قندھار کی قندھار کے بعض خنزین کا خیال تھا کہ یہاں کی بلدیہ دعوت سے مندری (میونسپلیٹی) کی طرف سے ہم کو دعوت چائے دی جائے اس کے لئے ضرورت تھی کہ کم از کم ایک روز اور ٹہریں لیکن قرب وطن کے شوق نے صرف ایک دعوت چائے کی خاطر ایک روز کی قربانی گوارہ نہ کی سرور خاں گویا نے بہت اصرار کیا مگر معذرت ہی کرنی پڑی اور یہی طے پایا کہ آج ۲ نومبر کی صبح کو قندھار سے روانگی ہوگی

قندھار کے باہر۔ قندھار کے باہر بھی بعض عمارتیں اور شاہی و عمومی باغ ہیں جن میں سے بعض خاص طور سے مشہور ہیں مگر وقت کی تنگی کے سبب سے ان کو دیکھنے کا موقع نہ ملا۔

وقا ترہ۔ سرکاری دفاتر کی عمارتوں میں بھی جانے کا اتفاق نہ ہوا سنا ہے کہ دفاتر کی عمارتیں اچھی ہیں مگر ابھی ان کی تنظیم موجودہ متدن نظام پر نہیں مبنی ہے ایک قاضی ہر قسم کے مقدمات کا فیصلہ کرتا ہے

ایک عجیب بات یہ ہے کہ فصل مقدمات کا طریقہ جس قدر ابتدائی ہوتا ہے اسی قدر مقدمات کم اور اپنی طبعی صورت میں ہوتے ہیں اور جس قدر ان کی ترتیب و تنظیم اور قواعد و قوانین کی پرپیچ راہیں اختیار کیجاتی ہیں اسی قدر نزاعات اور پیچیدہ مقدمات کی کثرت ہوتی جاتی ہے ہندوستان میں اس کا مشاہدہ ہر انسان کر سکتا ہے۔

پروانہ راہداری کی تصدیق۔ جن گونوں کے پاس ہندوستان سے

افغانستان جانے کے پاسپورٹ ہوں ضرورت ہے کہ واپسی کے وقت واپسی کی اجازت اور تصدیق افغانی و برطانی دفاتر میں کرا لیں ہم نے آسانی کے خیال سے کابل ہی میں اس مرحلہ کو طے کر لیا تھا چنانچہ پہلے افغانی دفتر نے اور پھر برطانی سفارت نے اس کی تصدیق کر دی۔

”برائے رفتن ہندوستان از راہ قلعہ جدید قندھار“
اس کے بعد ”برٹش لیگیشن کابل“ نے اس پر اپنی مہر تصدیق ثبت کی جو لوگ کابل سے یہ تصدیق نامہ اپنے ساتھ نہ لائیں ان کے لئے ضرورت ہے کہ وہ قندھار میں برٹش کونسل اور حاکم قندھار کے دفتر سے اپنے پاسپورٹوں پر یہ تصدیق کرا لیں ورنہ ان کو افغانستان سے نکلنے اور ہندوستان میں داخل ہونے کی اجازت نہ ملے گی۔

قندھار سے روانگی۔ آٹھ بجے صبح کو چائے اور ناشتہ سے فرصت کر کے قندھار سے روانگی کا سامان ہونے لگا سواری میں وہی موٹر تھی جس پر کابل سے اب تک میں اور ڈاکٹر صاحب بیٹھ کر آئے تھے یہ اچھی خاصی وسیع اور نہایت آرام دہ موٹر تھی کہہ چکا ہوں کہ افغانستان سے ہندوستان آنے کیلئے اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ برطانوی کونسل کے ایک فارم پر حسب ذیل امور کی خانہ پوری کر کے وہاں پیش کرنا ہوتا ہے موٹر کا نمبر، موٹر کے کارخانے کا نام، مدت استعمال، موجودہ کیفیت، موٹر کے مالک کا نام، شو فر کا نام اور اس کی سند اجازت وغیرہ جس موٹر پر ہم سوار ہو کر آئے تھے وہ ہندوستان پہلے بھی آچکا تھا اس لئے اس کا مذکورہ بالا فارم برطانوی کونسل کا پہلے ہی پاس

کہا ہوا موجود تھا اس لئے کوئی وقت پیش نہیں آئی اسی طرح جس لاری پر سائپا
آیا تھا وہ بھی مذکورہ بالا مرحلہ کو پہلے ہی ختم کر چکی تھی کہتے ہیں کہ یہ اعتیاد اس
کی جاتی ہے تاکہ راستہ کی خرابی سے کوئی افتاد پیش نہ آئے۔

روانگی کے وقت گورنر صاحب قندھار کی طرف سے ایک خریطہ یا
کچھ خشک میوے اور قندھاری انار کے دو ٹوکے تھنے میں آئے یہ ٹوکے
لاری میں لٹکا کر باندھ دئے گئے تاکہ وہ دبنے سے خراب نہ ہوں۔

۹ بجے کے قریب ارکب شاہی سے ہماری موٹر نے حرکت کی لاری
اسا کے علاوہ دستہ جو کابل سے ساتھ آیا تھا سوار تھا سرور خاں گویا جو تک
رفیق سفر ہیں ان کی تکلیف کے خیال سے ہم لوگ چاہتے تھے کہ وہ قندھار
ہی میں ٹھہر جائیں اور ہمارے ساتھ آگے نہ جائیں لیکن ان کی ہمان نوازی نے
یہ گوارا نہ کیا اور شاید کہ شاہی حکم بھی یہی ہو بہر حال وہ بھی ساتھ روانہ ہوئے۔
راستہ۔ قندھار سے تھوڑی دور تک تو سڑک اچھی ملی پہل بھی تھے مگر جوں
جوں آگے بڑھتے گئے راستہ کی خرابی تکلیف دہ ہوتی گئی اکثر پل ٹوٹے تھے
موٹروں کو ایسے مقامات پر پل سے نیچے اتر کر پھر بلندی پر چڑھنا پڑتا تھا ایسا
معلوم ہوتا تھا کہ بہادر افغانوں کے ساتھ ان کی موٹریں بھی بہادر ہوتی ہیں جو
ان خوفناک راستوں کو اس طرح نڈر ہو کر طے کرتی ہیں افغان شہزادوں کی بہادری
کی بھی داد دینی چاہئے جو اس دشوار گزار راستہ کو اس خوبی سے طے کرے جاتے ہیں
تختہ پل۔ قندھار سے چند میل نکل جانے کے بعد ایک منزل آئی جس کا نام
تختہ پل تھا شاید اس نام کی اصلیت یہ ہو کہ یہاں تختوں کا کوئی پل بنا ہوا

بہر حال ایک جنگی کی سرکاری عمارت ہے جو بدستور خام ہے یہاں قندھار سے آنے جانے والوں کے اسباب کی دیکھ بھال ہوتی ہے اور قابل محصول اشیاء پر جنگی وصول کی جاتی ہے ہم لوگوں کے ساتھ تحفہ کے چند قالین تھے، ان پر کابل ہی سے سرکاری طور پر ایک دھیلے کے برابر مہر کیا ہوا چٹا سیسہ پتلے تار سے باندھ دیا گیا تھا، یہ شاید کابل کے جنگی خانہ کا نشان ہو یا ان سامانوں پر یہ لگایا جاتا ہو جن کو حکومت جنگی کے محصول سے مستثنیٰ کر دیتی ہو۔
قاعدہ کے مطابق ہماری موٹریں بھی یہاں آکر رکیں اور جنگی کے محال سرسری طور سے دیکھ بھال کر ان کو آگے بڑھنے کی اجازت دی۔

صحرائے سندھ و بلوچستان۔ اب ہم جیسے جیسے لگے بڑھ رہے تھے راستہ خراب سے خراب تر آتا جاتا تھا بلکہ یوں کہنے کہ سرے سے راستہ ہی نہ تھا۔ ایک نئی ووق ریگستان تھا جس میں ہر موٹر اور لاری اپنا راستہ آپ تلاش کرتی ہے موٹروں اور لاریوں کی آمد و رفت سے ہر جگہ ریگ میں گڈھے پڑ پڑ جاتے تھے اور پھر ہوا کے جھونکے ان کو تھوڑی دیر میں بھر دیتے تھے آدھے آدھے پہنے ریگ میں دھنس دھنس جاتے تھے ایک موٹر یا لاری کے گزرنے سے ایک لیکھ جب خراب ہو جاتی ہے دو سر موٹر اور لاری والا اپنی موٹر اور لاری کو اس سے بچا کر دوسری راہ اختیار کر لیتا تھا اس طرح ہر روز ان سواریوں کی آمد و رفت سے بیسیوں نشان پڑ پڑ کر مٹ مٹ جاتے ہیں جہاں کہیں ذرا مٹی سخت بھی تھی تو وہ ان بھاری سواریوں سے چور ہو کر سرمہ ہو گئی تھی مگر! ایں ہمہ اسی ریت کے دلدل سے ہو کر بیسیوں لاریاں

آج رہی تھیں دیکھنے والوں کو سب زیادہ ہولناک سماں یہ نظر آتا تھا کہ کسی لاری کے ایک طرف کے پہے تو ریت میں دھنسے ہیں اور دوسری طرف کے پیچے زمین کی اصلی سطح پر ہیں اس سے لاری ایک طرف اتنی جھکی معلوم ہوتی تھی کہ ہم کو ڈر لگتا تھا کہ یہ کہیں الٹ نہ جائے ان سکند ہینڈ پرانی لاریوں والوں کی بیکسی پر کس قدر افسوس ہوتا تھا جو ہم کو جگہ جگہ بیکا پڑی نظر آتی تھیں اور ان کے شو فران کی درستی کے لئے اس بے نام و نشان صحرائیں کئی کئی گھنٹے مصروف رہتے ہیں۔

اس راستے کے پچ پچ میں پہاڑ بہت کم آتے ہیں بلکہ گویا نہیں ہیں اسلئے راستہ اور ریت کی دشواری جو کچھ ہو مگر درہ خیبر والے راستے کی طرح یہ خوفناک اور خطرناک نہیں۔

یہ صحرائے ریگ افغانستان و ہندوستان بلکہ ایشیائے وسطیٰ اور ہندوستان کا سب سے پرانا اور تاریخی راستہ ہے تاریخ کو جب سے علم ہے یہ راستہ تجارتی کاروانوں اور قافلوں کی آمد و رفت سے معمور نظر آتا ہے ہندوستان کے بہت سے فلاح اور کشور کشا اسی راہ سے ہندوستان میں داخل ہوئے تھے اور اسی راستہ سے ہندوستان آیا، ہامیون اسی راستہ سے ہندوستان سے نکل کر ایران میں داخل ہوا تھا بلکہ عجب نہیں کہ محمد بن قاسم ثقفی اسی طرف سے سندھ میں داخل ہوا ہو۔

یہ صحرائے ریگ قندھار کے حدود کے بعد سے شروع ہو کر بلوچستان و سندھ کے علاقوں سے گذر کر بحر ہند کے سواحل تک یوں نہیں چلا جاتا ہے

اس صحرا اور ہندوستان کے درمیان ایک پہاڑی سلسلہ دور سے برابر برابر ساتھ چلتا ہوا نظر آتا ہے اور اسی میں وہ مشہور درہ بولان ملتا ہے جس سے ادھر کے شمشیر آرمافتح وادی سندھ میں اتر کر ہندوستان میں داخل ہوتے رہے ہیں، احمد شاہ ابدالی بھی کئی دفعہ اس درہ سے گزر کر ہندوستان آیا تھا۔ قلعہ جدید۔ قندھار سے آٹھ بجے کے قریب چل کر ۱۲ بجے کے بعد ہم قلعہ پہنچے یہ اس سمت میں افغانستان کی آخری سرحد ہے یہاں ایک پرانا قلعہ نظر آیا جواب بالکل شکستہ ہے، دوسرا یہ نیا قلعہ ہے جس میں افغانی سرحدی چوکی اور جنگی خانہ اور پڑانہ راہداری کی دیکھ بھال کے دفاتر ہیں افغانستان کے عام دستور کے مطابق یہ قلعے بھی خام مٹی کے تھے ان کی چھتیں بھی مٹی کی کچی تھیں، اکثر چھوٹی چھتیں گنبد نما تھیں قلعہ کے اطراف میں سپاہیوں کے بارک تھے۔

ہندوستان کی آمد و رفت کے سبب سے یہاں لاریوں اور مسافروں کی اچھی خاصی پہل پہل تھی کھانے اور میوؤں کی دکانیں بھی نظر آتی تھیں، باورچی کی دکان جس کو دیسی ہوٹل کہتے وہ بھی موجود تھی۔ نیچے ہماری موٹر جیسے ہی آکر رُک کر قلعہ کے سپاہیوں نے صف بستہ ہو کر ہمارے اعزاز کا فرض ادا کیا، امور صاحب جو یہاں کے افسر تھے زمین سے اتر کر نیچے تشریف لائے اور جہانوں کا استقبال کیا یہ نوجوان خوش سلیقہ انگریزی لباس میں ملبوس سر پر ہیٹ لگائے اور اسی کے ساتھ داہنے ہاتھ میں سنگ شاہ مقصود کے بڑے بڑے زرد دانوں کی تسبیح ہاتھ میں لئے ہوئے تھے۔

بسیج کا فیشن۔ افغانستان میں اس قسم کی بسیجوں کا ہاتھ میں رکھنا ایک فیشن ہے یہ عموماً بڑے بڑے مفتیس^{۳۳} دانوں کی بسیج ہوتی ہے جس کو ارباب منصب اور امراء ہاتھوں میں لئے رہتے ہیں کبھی ان کے دانوں کو پھرتے ہیں اور کبھی ان سے کھیلتے ہیں۔

قلعہ جدید میں قیام۔ مامور صاحب ہم لوگوں کو ساتھ لے کر قلعہ کے بالائی حصہ میں گئے چھت پر ایک سائبان اور چند کمرے تھے جن میں سے ایک ملاقات یا کھانے کا کمرہ تھا اور دوسرے میں مامور صاحب کا دفتر تھا۔ کھانے کا سامان اور باورچی اور خدام کابل سے برابر ساتھ آ رہے تھے جہاں جہاں قیام ہوتا باورچی کھانا پکاتے اور خدام قرینہ سے میز سچ کر کھانا کھلاتے تھے یہاں بھی انھوں نے جلدی جلدی کھانے کا سامان کیا اور انھیں کمروں میں سے ایک میں میز پر کھانا لگانے کا انتظام کیا ظہر کا وقت آچکا تھا ہم نے ظہر کی نماز ادا کی اور یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ قلعہ کی دیوار کے نیچے ایک چبوترے پر جو خاص نماز کے لئے تھا سپاہی اپنی پوری وردیوں میں آتے اور فریضہ ظہر ادا کرتے ہم نے اپنے ساتھ کے سپاہیوں کو بھی اسی طرح نماز پڑھتے دیکھا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ یہ انگریزی وردی کے تنگ کپڑے ہمارے ہندوستانی بھلیوں کی طرح ان افغان سپاہیوں کے لئے ترک نما کا عذر نہیں بنے ہیں،

یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ پنجاب اور سرحد کے دیہاتوں کی طرح یہاں بھی کوٹھے کی بالائی چھت بیت الخلا اور استنجا خانے کے کام میں آتی ہے۔

یہاں ہمارے راہداری کے پروانوں کی دوبارہ تصدیق کی گئی
اور ان پر ”تحت نمبہ ۱۲۵۰۱۸۰۲۸ موقع خروج سرحد ملاحظہ شد“
لکھ کر مہر لگا دی گئی۔

جب تک یہ دفتری کارروائی ہوتی رہی ہم نے کھانا کھایا کھانے سے
فارغ ہو کر ہم ہندوستان کی سرحد کی طرف آگے بڑھنے کو تیار ہوئے۔
وداعی منظر۔ اب ہم افغانستان کی آخری سرحد میں تھے اور اپنے میراں
سے شاید ہمیشہ کے لئے جدا ہو رہے تھے ایک اسلامی حکومت کے روح افزا
مناظر کی سیر ابھی دل بھر کرنے بھی نہ پائے تھے کہ موسم بہار آخر ہو گیا قلعہ کے
تمام افسر اور عملہ نے رخصتانہ ہاتھ ملائے رفیق سفر سرور خاں گویا جوتنے دنوں
تک جلوت و خلوت میں ساتھ رہے تھے ہم کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ
رہے تھے اور ہم ان کو تک رہے تھے۔ ع

روئے گل سیر نہ دیدیم دیہار آخر شد

بیچارہ گویا بلبل قفس کی طرح ابھی تک افغانستان سے باہر نہیں گیا،
اور باہر کی دنیا کو صرف کتابوں کی آنکھوں سے دیکھا ہے وہ اس سرحد کے
پاس پہنچ کر پھڑک پھڑک کر رہ گیا، زبان حال یہ کہہ رہی تھی۔

اگر یک سر موئے برتر پریم فروغ تجلی بسوزد پریم سے
سب سے زیادہ موثر منظر اپنے ساتھ کے افغانی دستہ کے سپاہیوں
رخصت ہونے کا تھا یہ موٹر کے سامنے ایسا دہ تھے چلتے وقت انھوں نے
فوجی قاعدہ سے رخصتانہ سلام کیا مگر میں بیچارہ کہ نہ ”کشتوری“ (سولہین) تھا

نہ لشکری (مٹری) فوجی قواعد سے بے پروا ہو کر ایک ایک سپاہی سے نبل گیر ہو کر اور مصافحہ کر کے رخصت ہوا اور زبان سے صرف اسی قدر کہا کہ ”افغانستان کا قلعہ تم ہو۔“

افغانستان کا چمکتا بلبل گویا اس وقت خاموش تھا، اور مصافحہ و معانقہ کے بعد باہم مکاتبت و مراسلت کے وعدہ پر ہماری یہ چند روزہ ملاقات ختم ہو گئی موٹروں نے آگے کو حرکت کی اور چند منٹ کے اندر افغانستان کی سرحد کو پھانڈ کر انگریزی علاقہ میں داخل ہو گئیں۔

چین۔ ہندوستان کی پہلی سرحدی آبادی کا نام چین ہے دیکھنے میں تو یہاں ریگ اور خشک پہاڑوں کے سوا کچھ اور نہیں مگر یہاں کی معنوی خشکی کو لفظی تری سے دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے، کسی زمانہ میں چین بھی مملکت افغانستان کی ایک کیاری تھی مگر باغبان و صیاد کی باہمی کشمکش میں یہ ہاتھ سے جاتا رہا۔

افغانی علاقہ جو پہلی ختم ہوا وہ سیاہ تختہ کھڑا نظر آیا جس پر ہندوستان کی سرحد کا اعلان اور پروانہ راہداری کے بغیر اس سے آگے بڑھنے کی ممانعت لکھی تھی، سرحد کو عبور کیا تو چین کا سواد سامنے آگیا انگریزی کارخانوں کے ستون اور چمنیاں اور بلند مکانوں کی چھتیں دکھائی دینے لگیں یہ اصل میں تمانتر فوجی چھاؤنی ہے ہر طرف فوجی آبادی کے نشان نظر آتے تھے ہمیں بارکیں تھیں، ہمیں گھوڑ دوڑ کا میدان، ہمیں کھیل اور ورزش کی فیلڈ۔

آبادی آئی تو شاید افغانی مامور تجارت کے ذریعہ جس کو ہمارے آنے کی اطلاع تھی یا صبح کو سید اس مسعود صاحب کی زبانی لوگوں کو ہمارے اس وقت

آنے کی خبر ہو گئی تھی چنانچہ شہر کے دروازہ ہی پر مسلمانوں نے استقبال کیا اور ایک ریسٹوران میں لا کر بٹھایا اور اس بات کی تہنید کی کہ ہم آج اپنا سفر ملتوی کر کے رات کو یہاں کے مسلمانوں کے سامنے کچھ تقریریں کریں مگر ایک تو اس دور دراز سفر کے تکان سے چورتھے دوسرے ہندوستان کی سرحد پر پہنچ کر حب وطن کی آتش شوق تیز تر ہو چکی تھی اس لئے معذرت کی مگر ان کا اصرار برابر قائم رہا اور اس کے لئے مختلف تدبیریں کرتے رہے

یہاں پہنچ کر پہلا کام یہ کرنا پڑتا ہے کہ یہاں کے پولیس افسر کے دستخط پاسپورٹ پر کرائے جاتے ہیں اس کے بغیر آگے بڑھنا ممکن نہیں پاسپورٹ دستخط کے لئے بھیجے گئے لیکن اس کی واپسی میں دیر پڑ دیر ہوتی گئی اور ہماری اکھبن بڑھتی گئی اور یہ شبہہ ہوا کہ شاید ہمارے روکنے والے دوستوں کی یہ تدبیر نہ ہوتا کہ آج کا جانا کسی طرح ملتوی ہو جائے اس لئے ہم نے مناسب سمجھا کہ ہم خود افسر صاحب کے دو تھانے پر پہنچ جائیں انصرض ہم جیسے ان کے دروازہ تک پہنچے وہ باہر نکل آئے اور دستخط کر کے پاسپورٹ واپس کئے۔

ریسٹوران (چائے خانہ) میں مختلف خیال کے مسلمان جمع ہو گئے تھے جو سیاسیات کی مختلف راہوں سے آشنا تھے مجھ سے اور ڈاکٹر اقبال صاحب سے طرح طرح کے سوالات کرتے رہے مگر سب کے سب افغانستان کی ترقی و خیر خواہی کے جذبات سے مہمور تھے ڈاکٹر صاحب کے اسکول کے زمانہ کے ایک ہندو کلارا فیلو جو یہاں ڈاکٹر تھے ملنے آئے اور ڈاکٹر صاحب سے اپنا تعارف کرایا اثنائے گفتگو میں افغانستان کے متعلق ایک ایسا غور فقہ ان کی زبان سے نکلا جس سے

مسلمانوں کو سخت تکلیف ہوئی یہاں یہ سن کر افسوس ہوا کہ ہندو بھائیوں کو
موجودہ حکومت افغانستان سے اس لئے نفرت ہے کہ وہ اس کو "مستعصب" تسلیم
جاتے ہیں اور امیران اشراف اس لئے ہمدردی ہے کہ وہ ان کو
اسلام کا "باغی" تصور کرتے تھے حالانکہ ان کے یہ دونوں خیال غلط ہیں۔
یہاں حکومت افغانستان کا ایک مامور تجارت رہتا ہے، افغانی
تو فصل خانہ دہلی کے کاتب (کلرک) کو جو ہمارے ساتھ تھا مامور صاحب سے
مصارف سفر کے لئے رقم لینی تھی مامور صاحب کو اطلاع دی گئی تو انھوں نے
بھی کافی دیر لگائی پے درپے قاصدوں کے بھیجنے کے بعد وہ آخر آئے تو
اس شان سے آئے کہ آگے آگے وہ خود اور پیچھے پیچھے ان کے نوجوان
اہل خلیفہ صاحبزادے رسم تعارف کے بعد کاتب صاحب سے اور ان
دیر تک رد و بدل ہوتا رہا۔

ان تمام جھمیلوں کے بعد ہم چین سے آگے بڑھے سڑک اتنی عمدہ تھی کہ
لامحالہ انگریزی حکومت کی تعریف کرنی پڑتی ہے ہماری اسلامی و مشرقی
اصلاحات کے لئے بیشک بے قرار ہیں مگر اس زمانہ میں اصلاح کے معنی روپے
کے ہیں۔ جب تک ان کی اقتصادی حالت بہتر نہ ہوگی وہ اصلاحات کے
جاری کرنے پر قدرت نہیں رکھتیں ہر مسافر کو جو افغانستان کی سڑکوں سے نکل کر
ہندوستان کی سڑکوں پر آتا ہوگا بد اہت بغیر کسی دلیل و محبت کے مشرقی
سلطنتوں کی پستی اور انگریزی حکومت کی برتری کا خیال آجاتا ہوگا، اس لئے
ہماری مشرقی سلطنتوں کا فرض ہے کہ وہ ان ظاہری نقصان کو صرف پوری

ایک تو ہندوستان کی سڑکیں مقابلہ یوں بھی اچھی ہیں پھر انگریزی فوجی
اعراض نے چمن کے شہر کو نہیں تو چمن کی سڑکوں کو تو بیشاک چمن بنا دیا ہے سڑکیں
اتنی صاف ستھری ہموار اور چکنی کہ معلوم ہوتا تھا کہ پیٹے خود بخود پھسلتے جا رہے ہیں
چمن سے ریل شروع ہو جاتی ہے مگر ہم لوگوں نے ایک دن بچانے کی
خاطر چمن سے کوئٹہ تک ریل پر سفر کرنے کے بجائے موٹروں پر سفر کیا چمن سے
ریل صرف ایک وقت صبح کو چلتی ہے اگر اس پر سفر کرتے تو ضرور ہوتا کہ آج رات
بھر یہاں ٹھہرے اور صبح کو روانہ ہوں اور کوئٹہ سے ڈاک گاڑی بجے دن کو
چلتی تھی تو اگر آج شام تک کوئٹہ پہنچ جائیں تو رات بھر وہاں آرام کر کے
ابجے ڈاک سے کل ہی روانہ ہو سکیں گے یہ تجویز قندھارہ ہی سے طے شد تھی
کہ چمن سے کوئٹہ تک سفر انھیں موٹروں پر ہوگا اور کوئٹہ سے ریل پر سوار ہو جائیں گے
میرا اندازہ ہے کہ ہم بجے شام کے قریب ہم چمن سے روانہ ہو جائیں گے
چمن اور کوئٹہ کے درمیان غالباً ساٹھ ستر میل کی مسافت ہے ریل اس مسافت پر
پانچ گھنٹوں میں طے کرتی ہے صبح آٹھ بجے چل کر ایک بجے دن کو وہاں پہنچتی ہے
موٹریں بھی چار گھنٹوں سے زیادہ لگے جس کی وجہ بلندیوں کی چڑھائی اور ایک
طویل پر پیچ پہاڑی راستہ کا عبور کرنا تھا چمن سے تھوڑی دور نکلنے کے بعد ایک تیل
آیا اس پر ایک بھاری بنجیر کی روک پڑی ہوئی تھی جس کے اٹھائے بغیر اس
پارے اس پار جانا ناممکن تھا متین پہرہ دار نے چمن کے پولیس افسر کی تصدیق
دیکھ کر بنجیر ہٹائی اور موٹریں آگے بڑھیں۔

کوئٹہ اور ملتان

کوہستانی سڑک - شام کا وقت تھا، اور ایک بڑی چڑھائی باقی تھی اور یہ وہی طویل کوہستانی سلسلہ تھا جو افغانستان کو ہندوستان سے الگ کرتا ہے چمن اور کوئٹہ کے بیچ میں یہ ایک سہ سکندر ہے جس کے عبور کرنے کے بعد کوئٹہ سامنے آ جاتا ہے ریل اس پہاڑ کے نیچے سے سرنگ سے ہو کر گزرتی ہے اور موٹر اور لاری اور پیادہ مسافر اس پہاڑ کو عرض میں قطع کرتے ہیں اور اس عبور کر کے اس پار سے اس پار ہوتے ہیں۔ پہاڑ پر چڑھائی کے لئے حکومت انگریزی نے پہاڑ کو کاٹ کر اور جگہ جگہ نشیب و فراز کو ہموار کر کے موٹروں اور پیادہ چلنے والوں کے لئے نہایت عمدہ سڑک تیار کی ہے قدم قدم پر موڑ آتے تھے ادھر ادھر بغل میں غار اور خندقیں ملتی جاتی تھیں شو فر کی ذرا سی غلطی ہو تو پیغام بھی مشکل راستوں پر انگریزی میں ہدایتیں لکھی تھیں۔

موٹرنے آہستہ آہستہ اوپر چڑھ کر بیچ پہاڑ کے نشیب و فراز میں قدم رکھا عمدہ سڑک ہونے کے باعث پہلے خود بخود پھسلے جاتے تھے اور وہ بڑی تیزی سے راستہ قطع کرتی جاتی تھی خوش قسمتی سے کوئی دوسری موٹر مخالف سمت سے آئی ہوئی نہیں ملی اس لئے ہمارا شو فر اس ڈر سے اپنی موٹر بے تکان بھگا رہا تھا کہ رات ہونے سے پہلے وہ اس دشوار راہ کے خطروں سے باہر ہو جائے اس جلدی پر بھی شام ہو ہی گئی۔

روحانیات کا ذکر - عجیب اتفاق کہ راستہ تو یہ خطرناک درپیش تھا اور ڈاکٹر اقبال صاحب نے روحانیات کے ذاتی مشاہدات و تجارب اور ایک سچے

پر کی تلاش پر گفتگو شروع کر دی گفتگو طرفین سے نہایت دلچسپ ہو رہی تھی اس عہد کے مختلف شیوخ اور بزرگان ہداسل کا تذکرہ رہا اس سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب نے اپنے آغاز زندگی اور طالب علمانہ عہد کا ذکر چھیڑا پھر اپنے والد مرحوم کا تذکرہ کیا کہ وہ خود ایک صاحبِ دل صوفی تھے اور دیندار علماء کی صحبت میں رہتے تھے اس ضمن میں یہ معلوم ہوا کہ ہمارے جلیل القدر اسلامی شاعر کے حیاتِ ختمہ کے آثار میں جس مضرب نے حرکت پیدا کی وہ خود اُن کے والد ماجد کی ذاتِ بابرکات تھی۔

اثنائے گفتگو میں ڈاکٹر صاحب نے اپنی طالب علمی کے عہد کے ایک قصہ کے اثنائیں اپنے والد مرحوم کا ایک ایسا فقر و سناپا جس نے میرے دل پر بے حد اثر کیا فرمایا کہ اپنے وطن سیالکوٹ میں صبح کی نماز کے بعد قرآن پاک کی تلاوت کیا کرتا تھا ایک صبح کو نماز کے بعد حسب دستور میں تلاوت میں مصروف تھا کہ والد مرحوم ادھر آئے اور دریافت کیا کہ کیا کرتے ہو ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ آپ جانتے ہیں کہ میں اس وقت تلاوت کرتا ہوں فرمایا جب تک تم یہ نہ سمجھو کہ قرآن تمہارے قلب پر بھی اسی طرح اترتا ہے جیسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب اقدس پر نازل ہوا تھا تلاوت کا مزہ نہیں ڈاکٹر صاحب نے پوچھا یہ کیسے ہو سکتا ہے فرمایا کہ جب بی اے پاس کر دو گے تو بتاؤں گا کچھ دنوں کے بعد جب انھوں نے بی اے پاس کر لیا تو اس خوشخبری کے معاوضہ میں اس دن کی گفتگو کا حوالہ دے کر اس مقام کے حصول کی تدبیر پوچھی مرحوم نے اُن کو کچھ طریقے اور دعائیں تلقین کیں اور نوجوان بیٹے سے عہد لیا کہ وہ ہمیشہ اپنی زبان و قلم سے

ملت محمدی کی خدمت بجا لاتا رہے گا۔

ڈاکٹر صاحب کی شاعری ان کے والد مرحوم کی زندگی ہی میں پورا فروغ پا چکی تھی اور ایک عالم ان کے نغمہ سے سرشار و مست تھا۔ اور مسلمانوں میں وہ قیامت انگیز تاثیر پیدا کر رہا تھا، اور بالآخر باپ اپنے بیٹے کی اس عینی نفسی سے مسرور ہو کر اس دنیا سے سدھارا۔

پہاڑی راستہ اب ختم ہوا اور میدان کا منظر نمایاں ہو رہا تھا مغرب کے قریب پہاڑ کے نشیب میں میدان آیا، آبادی کا کچھ نشان آیا اور سیدھی سڑک دکھائی دی اس سڑک پر آگے بڑھ کر ایک چھوٹا سا شہر ملا جس کے چھوٹے سے دور ویہ بازار ہے ہو کر سڑک نکلی ہے یہاں پہنچنے کے ساتھ موٹر روک دی گئی اور پولیس کے ایک سپاہی نے آگے بڑھ کر ایک رجسٹر میں کیا جس پر غلام غلام بیرسٹر (رفیق ڈاکٹر اقبال) نے دستخط کر دئے جس کے بعد ہم آگے بڑھے معلوم ہوا کہ یہاں سے ہرگز ربنے والے کا نام درج رجسٹر ہوتا ہے۔

مغرب اور عشا کے سچ میں جب تاریکی خوب پھیل رہی تھی بجلی کے چراغوں کی روشنی دور سے قطار در قطار نظر آنے لگی یہ کوئٹہ تھا اس تاریکی میں روشنی کا یہ منظر آسمان پر جھللاتے ہوئے ستاروں کا سماں دکھا رہا تھا رفتہ رفتہ شہر قریب آیا، افغانی سفارت متعینہ دہلی کے نمایندہ نے ہمارے یہاں کے ڈاک بنگلہ میں تین کمرے لے لئے تھے وہیں آکر قیام ہوا۔

تمام ہیرو سامان لاری پر تھا اور وہ پیچھے رہ گئی تھی کوئٹہ میں اس وقت خاصی سردی تھی ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں آتش دان روشن تھا اور ہم سب

اس کے گرد میٹھے لاری کی آمد کا انتظار کر رہے تھے رات کی تاریکی اور سردی
 بڑھتی جاتی تھی اور لاری کا انتظار سخت سوہان روح کا باعث ہو رہا تھا،
 سب سے بڑے ڈر کی چیز یہ تھی کہ رات کی تاریکی میں کہیں لاری کو کوئی
 صدمہ نہ پہنچا ہو اس لئے ہم سب بہت پریشان تھے وقت گزرتا گیا اور
 وقت کے ساتھ پریشانی بھی بڑھتی گئی بالآخر دس بجے رات کے قریب
 لاری آئی اور معلوم ہوا کہ راستہ بنحیریت گذرا کابل میں جو بستر اور کس اور
 سوٹ کیس لاری پر رکھے گئے تھے ان کو آج پہلی دفعہ یہ موقع ملا کہ زمین پر
 قدم رکھیں ان دشوار گزار راستوں کے ہچکچاہٹوں اور تار چڑھاؤ کے جھیلو
 میں ان کی پوری درگت بنگلی چڑے کے بکسوں کے اکثر کونے اور گوشے لاری
 کی رگڑ سے کٹ کٹ گئے تھے بستر بندوں کے کپڑے اس سفر کے
 مشکلات کی تاب نہ لا کر اپنی اپنی جگہ سے ہٹ کر وزن دار ہو گئے تھے مگر
 شکر اللہ کہ جتا زہ منسلزل برسد

ہم نے کھانا ڈاک بنگلہ کے ڈائننگ روم میں کھایا کھانا انگریزی
 تھا مگر بہت مہبوی اور بہت خراب پکا تھا چار پاؤروٹی اور مکھن پر گڑ کھا
 لاری پہنچنے کی خوشی ہم سب بہت ہوئی تھی، میں آشدان کے پاس
 بیٹھا تھا لاری پہنچنے کی خوشی میں دفعۃً ٹھنڈک میں باہر نکل آیا اس کا اثر
 یہ ہوا کہ رات بھر بخار اور خفیف لرزہ میں مبتلا رہا صبح کو اٹھا تو طبیعت
 ہلکی تھی نماز پڑھی اور تھوڑی دیر کے بعد چائے پی کر پادہ تنہا شہر دیکھنے کو نکلا
 اور اسٹیشن تک گیا۔

کوئٹہ۔ یہ برطانی بلوچستان کا صدر مقام ہے، اور سمندر کی سطح سے پانچ ہزار
 فٹ بلند ہے۔ کہتے ہیں کہ اس کا پرانا نام کوٹ کوٹ تھا اور ایک معمولی
 پہاڑی سا تھا۔ ۱۸۴۷ء میں سر رابرٹ سیلڈین نے جب اس پر قبضہ کیا
 اور تعمیر کیا جس کا نام ان کے نام پر پورٹ سینڈویچین ہے تو اس کا نام
 زبانوں پر کوئٹہ ہو گیا یہ ہندوستان کا سب سے بڑا جنوبی فوجی مرکز ہے
 یہاں سے ایک ریلوے لائن ایران کی سرحد دُرداب تک جاتی ہے وہاں
 شُرک فداہار کو جدھر سے ہم آئے تھے اور تیسری ریلوے لائن کراچی کو جو
 یہاں سے پانچ سو میل دور ہے اور چوتھی لائن شکارپور ہو کر بھاولپور اور
 ملتان سے لاہور کو جاتی ہے۔

یہ ایشیائے وسطی، ایران، افغانستان اور ہندوستان کی تجارت اور
 بیوپار کی مرکزی منڈی ہے، میوے بکثرت اور تازہ بہ تازہ ملتے ہیں لیکن
 افسوس ہے کہ خشک میوؤں کی قیمت ہندوستان کے دوسرے شہروں سے
 کم نہیں مجھے صرف بادام کا تجربہ ہے۔ دو تونے کہا کابل میں خریدنا بے کار
 انھیں داموں میں کوئٹہ میں ملیں گے مگر یہ خیال غلط کابل میں بادام کابل
 بارہ آنے فی سیر تھے پشاور میں ہندوستانی بارہ آنے فی سیر دام ہیں لیکن
 کوئٹہ میں ڈیڑھ روپیہ سیر ملے انکور اور انار البتہ سستے ہیں۔

مکانات زیادہ تر جنگلہ نما ہیں چھتیس لکڑی اور کچھروں کی ہیں مگر کس
 کشادہ اور صاف ہیں آبادی میں مسلمانوں کا حصہ غالب معلوم ہوتا ہے۔
 رات کو آتے ہوئے کوئٹہ کو رواروی میں دیکھا صبح اٹھ کر سیدھی سر

چلا تو اسٹیشن پہنچ گیا سڑک کے دونوں طرف بنگلے تھے اسٹیشن بہت بڑا اور بہت پر رونق تھا چھاونی کی وجہ سے ہر طرف فوجی جہل جہل معلوم ہوتی تھی قلی پشتو، بلوچی، سندھی، فارسی، اردو سب ہی زبانیں بولتے تھے،

اسٹیشن سے واپس پھرتا تو ایک صاحب نے جو کلاؤ دستار اور کوٹ اور شلوار میں ملبوس تھے پیچھے سے مولنا مولنا کہہ کر مجھے ٹھہرانا چاہا میں ٹھہرا وہ دوڑتے ہوئے پاس آئے، اور پہلے اپنی اس حرکت کی معافی مانگی پھر پاسپورٹ دیکھنا چاہا، اور روانگی کا وقت پوچھا اور سفر کی مدت دریافت کی اور ارشاد کیا کہ میں خفیہ پولیس میں انسپکٹر ہوں اور اپنی خدمت اور ادائے فرض سے مجبور ہوں اور یہ بھی کہا کہ آج صبح میرا اس مسعود صاحب اسی بات پر خفا ہو گئے میں نے کہا آپ جو کچھ پوچھنا چاہیں مجھ سے دریافت کر لیں چنانچہ ان کے تمام مطلوبہ معلومات فراہم کر دیے اور ان کے سوالات کے جوابات دیدئے، وہ شکریہ ادا کر کے واپس گئے۔

راہ میں ملتان پڑتا تھا میرے ایک غریب دوست مولوی سید عبدالباری صاحب مدت سے ملتان میں رہتے ہیں ریلوے دفتر میں ملازم ہیں ساٹھ سال سے ان کا تقاضہ تھا کہ میں کبھی ملتان آؤں یہ موقع بے منت ہاتھ آیا ان کو تار دیا کہ کل دوپہر کو میل سے آنا ہوں۔

ابجے کے قریب ہم لوگ ڈاک بنگلہ سے چل کر اسٹیشن آئے انسپکٹر صاحب موصوف موجود تھے انھوں نے اپنی مہربانی سے اسباب کھانے اور ٹکٹ لینے میں مدد فرمائی ابجے کے قریب گاڑی آئی اور ہم لوگ آرام سوار ہو کر

روانہ ہوئے راستہ بہت پر لطف تھا جگہ جگہ پہاڑیاں مل رہی تھیں کچھ دور کے بعد صاف رنگستان آگیا اور گرد و غبار اور ریت سے واسطہ پڑنا اور سے کلکتہ تک راہ ٹینے جو راستہ ہے جس قدر وہ معمور ہے اسی قدر یہ راستہ ویرانہ تھا گھنٹوں کے بعد بھی کوئی آبادی نہیں آتی تھی یہ معلوم ہوتا تھا کہ قدرت نے اس کو سرسبزی اور شادابی محروم ہی رکھا ہے اب سندھ کا رنگستان شروع ہو گیا تھا کہیں کہیں جو اسٹیشن آجاتے تھے انھیں میں کچھ آبادی کا سراغ ملتا تھا تاہم یہ خوشی ہو رہی تھی کہ عمر پہلی دفعہ اس راہ سے گذر رہا ہوں جس پر فاتحین اسلام کے کاروان صدیوں چلے بھاو پلور۔ ریل اسی طرح دن بھر اور رات بھر چلتی رہی مشہور مقامات میں سے جیکب آباد اور تہکار پور گزرنے دوسرے روز کچھ دن چڑھے بھاو پلور آیا چونکہ نوابان بھاو پلور اور خصوصاً جدہ ماجدہ صاحبہ مرحومہ نواب صاحب بھاو پلور نے مذوۃ العلماء کی ہمیشہ مالی امداد فرمائی اس لئے میں نے بڑے شوق کی نظر سے اس کی طرف دیکھا اور اس سے ایک انس سا معلوم ہوا اس ریاست کے فرمانروا عباسی نسل سے ہیں احمد شاہ ابدانی کے زمانہ میں انھوں نے سندھ کے آٹھ حصہ پر حکومت قائم کی۔ رنجیت سنگھ نے اپنی حکومت پنجاب کے عہد میں ان کو زیر کرنا چاہا ۱۸۱۶ء میں ان سے ستر ہزار کا نذرانہ بھی بکبر حاصل کیا مگر یہ بہت جلد اسے آزاد ہو کر انگریزوں سے ملحق ہو گئے موجودہ عہد میں جامعہ عباسیہ ریاست مذکور کی علمی ترقیوں کی سب سے بڑی دلیل ہے سندھ کا مشہور شہر اُچ اسی ریاست کے اندر واقع ہے ناصر الدین قباچہ کے زمانہ میں یہاں مدرسہ فیروزی واقع تھا جس طبقات ناصری کے مصنف فاضل مہنچ سراج مدرس مقرر ہوئے تھے۔

ملتان - ۱۲ بجے کے قریب ملتان آیا سید عبدالباری صاحب کینٹن محمد عظیم صاحب
 الگزکیٹو افسر ملتان چھاؤنی، سید عبدالغنی صاحب بی اے وائس پریسیڈنٹ کنونٹنٹ
 سید میر حسن صاحب رئیس ملتان وغیرہ موجود تھے اسٹیشن سے سیدھے سید عبدالباری
 صاحب کے قیام گاہ پر آیا احباب آتے رہے اور ان سے ملاقاتیں ہوتی رہیں ان میں
 سب کے دلچسپ شخصیت سید میر حسن صاحب رئیس ملتان چھاؤنی کی تھی ساٹھ سیر کے
 درمیان عمر ہو گئی آنکھوں سے محذور ہو چکے ہیں تاہم کتابوں اور رسالوں کا نشانہ
 باقی ہے وہ خود اب نہیں پڑھ سکتے تو دوسروں سے پڑھا کرنا کرتے ہیں اس سیر کے
 خیالات سے بہت متاثر ہیں مگر اب امید ہے کہ اس ردِ عمل سے وہ متاثر
 ہو رہے ہیں جو سیر سید مرحوم کی فطرت پسندی کے باب میں اب عمل میں آ رہے ہیں
 علاوہ دوسرے دوستوں کے یہاں کی جامع مسجد کے خطیب امام مولانا
 سید اشفاق علی صاحب، فاضل دیوبند سے مل کر خوشی ہوئی یہ روشن ضمیر بھی ہیں
 اور روشن خیال بھی ملتان کے زمانہ قیام میں جو تین روز تک مستدہا موصوف
 کی صحبت سے بڑی دلچسپی لہی۔

ہمارے نوجوان دوست پروفیسر اکبر صاحب ضمیر جن سے مدت مرسلت
 تھی اور جو ایران کی سیاحت سے ہمارے لئے جدید فارسی شاعری کا تحفہ لائے تھے
 جن کا دیوان ماہ نو چھپر شائع ہو چکا ہے اور جن کی نظموں کے ذریعہ سے معارف
 کے ناظرین بھی ان سے آشنا ہیں وہ خوش قسمتی سے آج کل یہیں کے گورنمنٹ کالج
 میں فارسی کے پروفیسر تھے ان سے پہلے لاہور میں ملاقات
 ہو چکی تھی یہاں ان سے دوبارہ ملاقات ہوئی ضمیر صاحب

جدید فارسی اور اردو کے نازک خیال شاعر ہیں اور اخلاقاً نہایت متواضع اور نیک ہیں۔
 ملتان ہماری اسلامی تاریخ کا نہایت قدیم اور نہایت مشہور شہر ہے یہی
 وہ شہر ہے جسکو مسلمانوں نے محمد بن قاسم ثقفی کے زیر سرکردگی پہلی صدی ہجری کے آخر
 میں جب فتح کیا تو اس وقت سے لیکر سکھوں کے عہد تک یہ ہمیشہ اسلامی حکومت کا
 ایک اہم مرکز رہا غزنویوں کے فتوحات سے صدیوں پہلے یہاں مسلمان آباد تھے
 اور ان کی اسلامی حکومت قائم تھی، چوتھی صدی کے اواخر میں یہاں کی عربی حکومت
 مصر کے فاطمیہ کے زیر سایہ اسماعیلیت میں بدل چکی تھی اور اسماعیلی امرار یہاں
 حکومت کرتے تھے انھیں کا نام ہندوستان کی تاریخوں میں ملاحدہ اور باطنیہ آتا ہے
 محمود غزنوی نے اس کو باطنیوں کے ہاتھوں سے چھین کر اپنی سلطنت میں ملحق کیا
 غزنویوں کے ضعف کے بعد پھر اسماعیلیوں نے اس پر قبضہ کر لیا اور آخر شہاب الدین
 غوری نے ان کے ہاتھوں سے دوبارہ اس کو لے لیا۔

غزنویوں کی آمد سے پہلے تک یہ شہر عربوں کی تہذیب و تمدن کا مرکز
 تھا غزنویوں کی فتح سے اس کا تعلق مصر کے بجائے غزنین سے ہو گیا تاہم یہ
 ہر دور میں اسلامی علوم و فنون کا بڑا مرکز رہا علامہ بیرونی المتوفی ۴۴۰ھ نے
 بھی یہاں قیام کیا تھا چشتیوں کو چھوڑ کر تصوف کا دوسرا خانوادہ جو ہندوستان میں
 سب سے زیادہ پھیلا وہ سہروردی تھا جس کے بانی حضرت شیخ ابوالنجیب شہاب الدین
 سہروردی المتوفی ۶۶۷ھ مرتھے سہروردی خاندان کے فیوض و برکات کا حشر ہے
 یہی شہر ہے شیخ الاسلام بہاوالدین زکریا ملتانی (ولادت ۷۷۵ھ - وفات ۸۵۶ھ)
 نے ترکستان و خراسان و عراق و حرمین محترمین سے علوم دینی کا اکتساب کیا تھا

ابو حفص عمر شہاب الدین سہروردی المتوفی ۷۲۳ھ سے خواجہ انجیب شہاب الدین سہروردی کے بھتیجے اور مرید تھے تصوف کی دولت حاصل کی اور عراق سے اس مکتان میں منتقل کیا مشہور صوفی شاعر عراقی اسی میخانہ کے جرعہ خوار تھے

غزنویوں کا تو حال معلوم نہیں مگر غوریوں کے عہد میں ناصر الدین قباچہ جو سلطان آتش کا معاصر اور سندھ کا فرمانروا تھا یہاں پہلی علمی درسگاہ قائم کی جس میں مولانا قطب الدین کاشانی نے ماوراء النہر سے آکر درس و تدریس کی مسند بچھائی یہ شیخ الاسلام بہاء الدین کا آغاز عہد تھا وہ بھی یہاں آیا کرتے تھے شیخ فرید الدین گنج شکر (ولادت ۶۸۴ھ وفات ۷۴۸ھ) نے بھی مولانا ماج الدین سے یہیں فقہ کی تعلیم حاصل کی۔

خراسان و ایران سے جو علماء اور اہل کمال اس راستہ سے ہندوستان آتے تھے ان کی پہلی منزل ہی شہر مکتان ہوتا تھا اس سبب سے یہاں علماء و فضلاء کا بڑا مجمع رہتا تھا۔

علاء الدین خلجی کے زمانہ میں جو علماء امام وقت تھے ان میں چار بزرگ مکتان کے تھے مولانا محبوب متانی مولانا حمید الدین متانی مولانا شہاب الدین متانی اور مولانا علیم الدین نمبرہ شیخ الاسلام متانی یہ دہلی آکر علوم عقلی و نقلی کے درس دیتے تھے ہندوستان میں محققات کا درس میں داخل ہونا بھی مکتان ہی کے تفسیل مکتان کی بربادی کے بعد سلطان سکندر لودھی کے زمانے میں شیخ عبد اللہ اور شیخ عزیز اللہ مکتان سے آئے اول الذکر نے دہلی میں اور آخر الذکر نے سنبھل (مراٹھا) میں ہنگامہ درس گرم کیا،

لمتان کو ایک نظر دیکھنے کے بعد اس کی شدید مشابہت قندھار سے ظاہر ہوتی ہے وہی خام مکانات وہی ریگستان وہی بارش کی کمی لوگ کہتے ہیں اگر ہندوستان جیسی ایک بارش بھی لمتان میں ہو جائے تو وہاں کے اکثر مکان مگر جائیں لمتان کے متعلق ایک مشہور شعر زبان زد ہے۔

چار چیز است تحفہٗ لمتاں گرد و گرا، گدا و گورستاں

جہاں ریت ہو اور بارش کی کمی ہو وہاں کمی گرمی کا کیا پوچھنا اور گرد و غبار تو ریگستان کا جوہر ہے گداؤں کا زور پہلے ہو گا مگر اب شاید نہ ہوتا ہم ایسے درویش یہاں بہت ہیں جو گوبزرگوں کی گدیوں کے پوریا نشین ہیں مگر ان کی زندگی امیرانہ ہے اور یہ رنگ غالباً حضرت شیخ الاسلام زکریا سہروردی کے بعد ہی سے شروع ہو گیا تھا چنانچہ شیخ الاسلام کے پوتے حضرت رکن عالم سلاطین دہلی کے مقرب تھے اور بقول ابن بطوطہ وہ حاکم لمتان کی منظوری کے بغیر کسی کو اپنا جہان بھی نہیں بناتے تھے اور گورستاں کا کیا پوچھنا کہ اس پرانے شہر کا چپہ چپہ اسلامی عظمت کا ایک ایک مدفن ہے۔

چپہ چپہ یہ ہے یاں گوہر کیتا ہر خاک دفن ہو گا نہ کہیں ایسا خزانہ ہرگز بڑے بڑے علماء اور بزرگوں کے مقبرے اور مزارات ہیں جن میں سے سوائے ان کے جن کی نسل میں جاگیریں ہیں باقی بے نشان ہیں مدفن سے مولد یاد آیا کہتے ہیں کہ لمتان کو ایک اور فخریہ حاصل ہے کہ اس کی سرزمین میں عظیم الشان بادشاہوں کا مولد ہے سلطان محمود تغلق (ناصر الدین محمد شاہ) سلطان بہلول لود اور سلطان احمد شاہ ابدانی ان تینوں بادشاہوں کی جائے پیدائش بھی لوگ

بتاتے ہیں سلطان محمود تغلق لاہوری دروازہ سے کچھری جانے والی سڑک کے ایک محلے میں جس کو کولہ تلوہ خاں کہتے ہیں پیدا ہوا سلطان بہلول لودھی کی ولادت حسین آگاہی میں ہوئی اور سلطان احمد شاہ ابدالی کا مولد کشن صاحب کے بنگلہ کے قریب لب سڑک ایک مکان تھا جواب بے نشان ہے مگر یہ واقعات شاید تاریخ کے رو سے درست نہ ہوں۔

عصر کی نماز کے بعد دوستوں کے ساتھ ملتان کے قابل دید مقامات کی سیر کو بخلا عربی تاریخوں میں ملتان کے ایک مشہور مندر کا ذکر آتا ہے جس کے اندر سے سندھ کے عرب فاتح محمد بن قاسم ثقفی کو بڑی ضرورت کے وقت بہت سونا ہاتھ آیا تھا اس نے اس مندر کو توڑا نہیں بلکہ اصلی حالت پر چھوڑ دیا اور اس کے قریب ایک جامع مسجد بنوا دی اس کے بعد جو عرب ریاستیں یہاں قائم ہوئیں انھوں نے بھی اس کو نہیں چھڑا بلکہ یہاں کے جاتیوں پر ٹیکس لگا کر خوب آمدنی حاصل کرتی رہیں کمزور ہو جانے پر جب کبھی کوئی ہندو راجہ ان پر حملہ کرنا چاہتا وہ یہ کہہ کر اس کو ڈراتی تھیں کہ اگر تم نے ذرا ہماری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا تو ہم اس مندر کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے اس دھمکی سے وہ ڈر جاتا تھا اور ملتان پر حملہ نہیں کرتا تھا بیرونی نے کتاب الہند میں لکھا ہے کہ اس کے بعد جب باطنیوں نے ملتان پر قبضہ کیا تو جلم بن شیبان اہم علی نے ثقفی کی جامع کو بند کر کے اس مندر کو توڑ کر جامع مسجد کر دیا بعد ازیں سلطان محمود نے باطنیوں کو شکست دیکر ملتان کو فتح کیا تو مندر والی مسجد کو ویران کر کے پھر پہلی جامع مسجد کھول دی۔

بیرونی کا چشم دید بیان ہے کہ اس مندر کی عمارت کی جگہ بلندی پر تھی اور اینٹ سے بنی تھی لیکن اس کے زمانہ میں اس کے اکثر حصے میدان ہرکچہ تھے سیر کے لئے نکلنے وقت مجھے یہی چیز پہلے یاد آئی، لوگوں نے کہا یہ مندر اب تک باقی ہے اور اب اس کا نام پرہلا دپوری ہے۔

پرہلا دپوری کا مندر۔ یہ مندر موجودہ شہر سے باہر پرانے قلعہ کی جانب شمال ایک مقام پر واقع ہے اسی سے متصل شیخ الاسلام ہیا الدین زکریا کی قدیم خانقاہ ہے موجودہ عمارت اینٹ کی بنی ہوئی ہے، پچھلے کے بعد ایک وسیع صحن ہے چاروں طرف سائبان ہے اس میں پرہلا دپور سنگھ جگت اور کشمی ہماراج کی مورتیاں ہیں اس مندر کے اندر مسلمانوں کو نہیں جانے دیتے اس لئے اندر کی کیفیت معلوم نہ ہو سکی۔

اس مندر کے متعلق مقامی روایت یہ ہے کہ اب سے تیس لاکھ برس پہلے یہاں ہرینہ کشیپو نام ایک راجہ حکمرانی کرتا تھا یہ راجہ خدائی کا دعویٰ کرتا تھا تمام رعایا کو حکم تھا کہ وہ راجہ ہی کی پوجا کرے جو اس سے سربانی کرتا اس کی سزا موت تھی اتفاق سے راجہ کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام پرہلا د رکھا گیا جب یہ سن شعور کو پہنچا تو اس نے اپنے باپ کی خدائی سے انکار کیا اس کو طرح طرح کی سزائیں دی گئیں مگر باز نہ آیا آخر تنگ آکر ہرینہ کشیپو نے ایک آہنی ستون کو آگ سے سُرخ کیا اور پرہلا د کو حکم دیا کہ وہ اس ستون سے چمٹ جائے اس حکم کی تعمیل میں اس نے جب اس ستون سے چمٹنا چاہا تو فوراً ستون نیچ سے پھٹ گیا اور اس میں سے ایک شخص نمودار ہوا جس نے راجہ کو مار ڈالا اسی واقعہ کی یادگاریں ایک مدت کے بعد یہ مندر تعمیر ہوا۔

علامہ بیرونی کا بیان ہے کہ ”یہ مندر سورج ٹوٹا کا تھا اور اسی لئے اس کا نام آدہ تھا یہ لکڑی کا بنا ہوا تھا اور اس کی دونوں آنکھوں میں دوسرخ یا قوہ جڑے تھے اور بدن پر سرخ رنگی ہوئی کھال تھی لیکن اب ان چیزوں کا وجود ہی نہیں رہا۔“ کی انگریزوں کی لڑائی میں اس مندر کو کافی نقصان پہنچا تھا جس کی مرمت بعد کو ہو گئی اس مندر پر بہت سے اوقاف ہیں، مندر کا انتظام زرنگہ مندر کمیٹی کرتی ہے۔

خانقاہ و فرار حضرت بہاء الدین زکریا

یہ خانقاہ جو اب فرار کی صورت میں ہے اس مندر سے بالکل ملا ہوا اس کی مغربی سمت میں واقع ہے میرا خیال ہے کہ اگر یہ پرہلاہ مندر ہم ہی آدہ دیتا تو والا پرانا مندر ہے تو عجیب نہیں کہ یہ خانقاہ پہلے وہ مقام جس کو مسجد بنا دیا تھا ملتان میں ”یہ خانقاہ بہاء الحق“ کے نام سے مشہور ہے کہتے ہیں کہ اس خانقاہ کی تعمیر حضرت بہاء الدین زکریا نے خود کرائی تھی اور یہاں بیٹھ کر چالیس برس تک حدیث کا درس دیا تھا خانقاہ کا رقبہ بہت وسیع ہے دو بڑے پھانک ہیں ارد گرد عمارتیں بنی ہوئی ہیں۔

پھانک کے بعد پہلے ایک صحن ہے صحن کے بند ایک گلیاں اساہے جس کو طے کرنے پر اصل مقبرہ آتا ہے جو ایک لمبے کمرہ کی صورت میں ہے اس کے اوپر گنبد مقبرہ کے اندر بیچ میں حضرت شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا ملتانی سہروردی کا بچہ فرار ہے فرار کے اوپر سیاہ شامیانہ تن ہے اس فرار کے ہر طرف تہ ترسب ان کی اولاد و احفاد کی قبریں ہیں باہر خدام اور مجاہد بیٹھے زائرین سے نذر وصول

کر رہے تھے میں سیدھے حضرت کے مزار پر گیا دھائے منونہ پڑھی مقبرہ کے اندر خاصی تاریکی تھی تاہم آنکھیں بند کرتے ہی ایک نور سا چمک گیا، مہروردی خاندان کا سرتاج یہاں محو استراحت ہے میں سبب نہیں جانتا تاہم دل نے ایک اثر محسوس کیا اور آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے نکل کر ڈھلک گئے۔

شیخ الاسلام مہروردی کا سالانہ عرس ہوتا ہے بادشاہوں نے یہاں بہت کچھ وقف کیا تھا مگر اب چند دیہات رہ گئے ہیں خان بہادری شیخ مرید حسین قریشی اس کے متولی ہیں اور غالباً انھیں کے خاندان میں تولیت محذو ہے شیخ الاسلام کے مزار کے برابر ان کے بزرگ صاحبزادہ اور جانشین حضرت صدر الدین المتوفی ۸۷۷ھ کا مزار ہے یہ وہی بزرگ ہیں جس کے عہد میں سلطان غیاث الدین بلبن کا نامور بیٹا محمد سلطان خاں شہید ملتان کا حاکم تھا اور جس نے تاتاری حملہ کے سیلاب کو جس کے تحصیروں میں خلافت بغداد کی کشتی ڈوب گئی تھی ملتان میں کامیابی کے ساتھ روک دیا تھا، اور آخر خود اسی واقعہ میں اتفاقاً شہید ہو کر خان شہید لقب پایا حضرت امیر خسرو دہلوی بھی اس شہزادہ کے ساتھ اس ہنگامہ میں ملتان میں تھے۔۔

ملتان سے لکھنؤ

استدراک۔ چمن اور کوئٹہ کے بیچ میں جو کوہستانی سلسلہ حائل ہے

اور جس کو عرض میں قطع کر کے چمن سے کوئٹہ پہنچتے ہیں ہمارے رفیق
 غلام رسول خاں نے بتایا کہ اس کا نام جو جاک ہے اور جس درہ سے نکل کر
 یہ انگریزی سڑک نکالی گئی ہے اس کو درہ جو جاک کہتے ہیں یہ راستہ
 جس قدر پر پیچ ہے اس کی کیفیت تو بیان کر چکا ہوں خاں صاحب نے
 جب اس کا نام جو جاک بتایا تو میں نے عرض کی کہ اس سے بہتر تو
 اس کا نام گنججاک ہے اس کی بلندی تقریباً سات ہزار فٹ اور درہ
 کی لمبائی تقریباً بیس میل ہے۔

رکن عالم - ملتان میں حضرت شیخ الاسلام ڈکڑ یا ملتانی کے مزار پر ہم نے
 آپ کو چھوڑا تھا وہاں سے اس کے دوسرے دروازے سے ہم نکلے
 تو موٹر سڑک پر ادھر ہی کھڑی ٹلی سامنے ہی بسبت مغرب حضرت
 شیخ الاسلام کے پوتے حضرت رکن الدین رکن عالم المتوفی ۱۳۷۷ھ
 مزار کا گنبد نظر آیا، لیکن دل میں کشش نہیں ہوئی اس لئے وہاں تک
 جانہ سکا۔

سلطان محمد تغلق کے دربار میں حضرت رکن عالم کا بڑا اعزاز
 تھا ابن بطوطہ ہندوستان انھیں بزرگ کے عہد میں آیا ہے حضرت
 برہان الدین اسکندری نے ابن بطوطہ کو اسکندریہ کے قیام کے
 زمانہ میں جن تین مشہور بزرگوں کی زیارت کی خوشخبری سنائی تھی ان میں
 سے ایک یہ بھی تھے، ابن بطوطہ ملتان میں انھیں کی خانقاہ میں جو شہر سے
 باہر تھی حاکم دقت کی اجازت سے شہر آتھا۔

حضرت رکن عالم کا یہ روضہ سلطان محمد تغلق نے بنوایا تھا دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ اس کی عمارت نہایت خوبصورت ہے اور اس میں نقاشی کا کام نہایت عمدہ ہے اس مزار پر چند دیہات وقف ہیں اور اس کے متولی بھی شیخ مرید حسین صاحب ہیں۔

مزار شمس تبریز - شمس تبریز کے نام سے تو حضرت مولانا جلال الدین رومی کے مرشد مشہور ہیں جن کی طرف دیوان شمس تبریز منسوب ہے ملتان میں ایک مزار اسی نام سے مشہور ہے اہل تاریخ کے نزدیک اتنا تو مسلم ہے کہ یہ وہ شمس تبریز نہیں جو مولانا رومی کے پیر تھے مگر پھر یہ کون تھے اس کے جواب میں یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ اسماعیلی مذہب کے کوئی داعی تھے ایک مختصر سخن اور برآمدہ کے بعد ایک کوٹھری میں ان کا مزار ہے مزار پر گنبد بنا ہے دیواروں پر چینی کا کام ہے جس وقت میں وہاں پہنچا کچھ لوگوں کو باہر قرآن پڑھتے دیکھا دل نے کشش نہ پائی جلد واپس آگیا۔

ان کی نسبت مقامی اطلاع یہ ہے کہ ان کا نام شمس الدین تھا ۷۴۲ھ (۱۳۴۰ء) میں بگرام سبزواری پیدا ہوئے اپنے مرشد کے حکم سے ملتان تشریف لائے مشہور ہے کہ یہ حضرت شیخ الاسلام بہاء الدین زکریا کے ہم عصر تھے حضرت کے اشارہ پر اہل ملتان نے ان سے مقاطعہ کر لیا یہاں تک کہ کسی نے ان کو پکانے کے لئے آگ بھی نہیں دی انھوں نے ناچار اپنی یہ کرامت دکھائی کہ دریلے مچھلی اٹھا کر آفتاب کے سامنے

اور کہا کہ اے آفتاب تو میرا ہمنام (شمس) ہے قریب آ جا کہ مچھلی بھون بھون آفتاب قریب گیا اور مچھلی بھن گئی کہتے ہیں کہ لٹان میں گرمی اسی وقت سے زیادہ ہو گئی تھی
 (۱۲۳۰ھ) ان کی تاریخ وفات بتائی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ ۱۲۳۰ھ میں ان کے پوتے نے یہ عمارت تیار کرائی ہے اس کے متولی شیعہ ہوتے ہیں موجودہ متولی و سجادہ نشین سید ضمیر حسن شاہ صاحب ہیں

عید گاہ اس وقت لٹان کی سب سے یادگار عمارت عید گاہ کی مسجد ہے یہ شہر سے شمال و مشرق سمت میں ایک میل کی مسافت پر واقع ہے دروازہ بجائے پورب رخ کے ایک بازو پر ہے اس سے داخلہ کے وقت مسجد کی پوری شان ظاہر نہیں ہوتی دروازہ سے داخل ہوتے ہی بائیں بازو پر مسجد کی عمارت ملے گی صحن بہت وسیع ہے اندازہ ہے کہ اس میں ایک نہر آدمی آسکتے ہوں گے مسجد کا دالان چھ لمبا ہے اوپر گنبد اور مینار ہیں دیواروں پر کاشی کا نہایت عمدہ کام ہے پروفیسر اکبر صاحب منیر نے جو ایران و عراق کی سیاحت کر چکے ہیں اور اس وقت میرے ساتھ تھے کہا کہ یہ کام ایران کے سوا اور کہیں میں نے نہیں دیکھا اس مسجد کو نواب عبدالصمد خاں صوبہ دار لاہور و ناظم لٹان نے بنوایا تھا ۱۲۲۵ھ میں تکمیل کو پہنچی تھی نواب عبدالصمد خاں کا خطاب سیف الدولہ وزیر جنگ تھا اور اسی لقب سے آثار الامراء میں ان کا تذکرہ ہے سلطان محمد فرخ سیر کے عہد میں پنجاب میں صوبہ دار مقرر ہوئے اس زمانہ میں یہاں سکھوں کی بڑی شورش تھی عبدالصمد خاں نے اپنے زمانہ میں ان کے اصل مرکز کا کامیاب محاصرہ کیا اور ان کے سرداروں کو قید کر کے دلی بھیجا بعد میں یہ لٹان کے ناظم مقرر ہوئے اور ۱۲۳۵ھ میں وفات پائی

۱۸۵۷ء میں سکھوں نے ملتان کو فتح کیا، کہتے ہیں کہ ان کے زمانہ میں یہ جامع مسجد صراطِ مستقیم کے کام میں لائی جاتی رہی ۱۸۵۷ء میں مسٹر اگنیو اور انڈرسن جو ریاست لاہور کے انگریز ریزیڈنٹ کے نمائندے ہو کر دیوان مولراج کو ملتان کی نظامت سے معزول کرنے آئے تھے یہیں فروکش ہوئے تھے اور یہیں مولراج کے سکھ افسروں کے ہاتھوں قتل ہوئے تھے عمارت کے بائیں طرف کے آخری منارہ پر انگریزی زبان میں حسب ذیل کتبہ ہے۔

”یہاں ۲۹ مارچ ۱۸۵۷ء کو پیریک وان اگنیو بنگل سول سروس اور
نفسٹ ویسٹ انڈرسن سکینڈ کمپنی فیوز لیٹر جلاہور کے اسٹنٹ ریزیڈنٹ تھے
نہایت جبر جی سے قتل کئے گئے“

اس واقعہ کے بعد لڑائی پیش آئی جنگ کے بعد جب امن ہوا تو انگریزوں نے یہاں ڈپٹی کمشنر کی کچہری قائم کی ۱۸۶۳ء میں مسلمانوں کی درخواست پر ان کو واپس ملی اس وقت یہ نہایت خستہ حالت میں تھی مسلمانوں نے عام چندہ اس کی مرمت کرائی اس وقت یہ مقامی انجمن اسلامیہ کے زیرِ نظم ہے زمین کے چند بگھے اس پر وقف ہیں جن کی اسی قدر آمدنی ہے کہ اس سے چوکیدہ کی تنخواہ نکل آتی ہے ضرورت ہے کہ اہل شہر اپنی اس تاریخی مسجد کی بقاء و ترقی کی طرف توجہ فرمائیں۔

مسجد علی محمد خاں - دلی کی مرکزی حکومت میں جب ضعف ہوا تو پنجاب اور سندھ کے قطعہ قطعہ میں افغان سرداروں اور سکھ مثلہ داروں (تجہ داروں) نے سکھوں نے اپنے جنہ داروں کے لئے یہ اصطلاح قائم کی تھی ”سس“

۱۹۷
اپنی چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستیں قائم کر لی تھیں، راجہ رنجیت سنگھ نے
جو خود ایک مثل دار (جتھدار) کا بیٹا تھا رفتہ رفتہ ان تمام سکھ جتھوں کو
توڑ کر ایک مرکزی سکھ ریاست قائم کر لی اس مرکزیت سے طاقتور ہو
اُس نے ایک ایک اسلامی ریاست کو فتح کرنا شروع کیا اس زمانہ کی
یادگار صرف بھاو پور کی اسلامی ریاست رہ گئی ہے اس زمانہ میں ملتان
میں بھی ایک اسلامی ریاست قائم تھی جس کا بانی درانی سلسلہ کا صدوزئی
افغان تھا نواب علی محمد خاں شجاع خاں اور منظر خاں بہادر صغدر جنگ اس
خاندان کے مشہور افراد ہیں رنجیت سنگھ نے اسی خاندان سے اس ملک کو
فتح کر کے دیوان مول راج کے باپ کے حوالہ کیا دیوان مول راج سے
۱۷۹۹ء میں انگریزوں نے چھینا۔

اس صدوزئی افغانی ریاست کی یادگار یہ مسجد ہے اللہ میں
بنائی گئی تھی، سکھوں کے زمانہ میں یہاں سکھ ناظم ملتان کی کچھری ہوتی تھی،
اور اس کے اندر سکھوں کی مذہبی کتاب گرنٹھ صاحب کو رکھا گیا تھا انگریزوں
کے قبضہ کے بعد یہ مسلمانوں کو واپس دی گئی مسجد کے متعلق چند دکانیں ہیں
جن کی آمدنی سے مسجد کا خرچ پورا ہوتا ہے۔

باغ عام و خاص۔ دہلی دروازہ کے باہر خانقاہ شمس تبریز کے جنوب
واقع ہے کہتے ہیں کہ یہاں شاہنشاہ مراد بن شاہ جہاں بادشاہ عام لوگوں
کی عرضیاں سننے کے لئے اجلاس کرتا تھا اور اس کا دربار خاص بھی یہیں لگتا تھا
اس لئے باغ عام و خاص کے نام سے مشہور ہوا، سکھوں کے عہد میں مول راج

باپ سائزل مل جو رنجیت سنگھ کی طرف سے یہاں کا دیوان و صوبہ دار مقرر ہوا تھا اس میں اجلاس کرتا تھا۔

یہاں اس شاہی باغ کے علاوہ ایک حضوری باغ ہے جس میں ایک عمارت اب تک قائم ہے اس کو بھی شہزادہ مراد نے بنوایا تھا۔ پیرانا قلعہ - یہ قلعہ ایک بلند اور وسیع ٹیلہ پر واقع ہے جب یہ آباد تھا تو اس کا رقبہ سوا میل کا تھا اس کے ایک طرف دریائے راوی بہتا تھا قلعہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی عبادت گاہوں کے نشان اب تک باقی ہیں چونکہ یہ جگہ بہت بلند ہے شام کے وقت ٹھنڈی ہوا کے جھونکے یہاں بہت آتے ہیں اس لئے اہل شہر یہاں سرشام ہوا غوری کے لئے بکثرت آتے رہتے ہیں یہاں سے کھڑے ہو کر دیکھتے تو سارا شہر نظر کے سامنے ہو گا۔

اس وقت یہ قلعہ تودہ خاک ہے، صرف ایک وسیع ہال اپنی حالت پر آج تک کھڑا ہے، یونیورسٹی نے اپنے سالانہ امتحان کے لئے اسی بد حال ہال کو پسند کیا ہے، اس میں یونیورسٹی کی طرف لڑکوں کا سالانہ امتحان ہوتا ہے :-

قلعہ کے بیچ میں مسٹر اگنیو اور انڈرسن صاحبان کے دروازے قتل کی یادگار میں پچاس فیٹ لمبا مینار کھڑا کیا گیا ہے۔

جامع مسجد - یہاں جامع مسجد بھی ہے اندر جانے کا اتفاق نہیں ہوا مولانا اشفاق علی صاحب فاضل دیوبند جو اس کے خطیب و امام ہیں میرے ساتھ

تھے مغرب کا وقت قریب تھا درگاہ شیخ اسلام بہار الحق سے واپس
 جوتے ہوئے موصوف یہاں اتر گئے یہ جامع مسجد ایک انتظامی مجلس کے
 زیر نگرانی ہے اور جناب سید میر حسن صاحب اس کے متولی ہیں۔
 ملتان چھاؤنی۔ ملتان دو حصوں میں منقسم ہے ایک پرانا شہر ملتان ہے
 اور دوسرا نیا ہے جس کو ملتان صدر یا ملتان چھاؤنی کہتے ہیں جو انگریزی
 فوجی کیمپ یا کینیٹونمنٹ ہے یہاں کی آبادی اچھی خاصی ہے بگلے اور
 کوشیاں بکثرت ہیں مسلمانوں کی آبادی بھی خاصی ہے یہاں کے قومی
 رہبر و کارکن سید میر حسن صاحب ہیں جو گو آنکھوں سے معذور اور ضعیف
 ہو چکے ہیں تاہم یہاں کے معتمد علیہ وہی ہیں ان کے صاحبزادے
 سید عبدالغنی صاحب بی اے یہاں گورنمنٹ اسکول میں ہیڈ ماسٹر
 ہیں اور قومی کاموں میں اپنے والد ماجد ہی کی طرح سرگرم ہیں۔
 سید میر حسن صاحب اور دوسرے مسلمانوں کی کوشش سے لاہور
 میں یہاں محمدن ہال کے نام سے ایک عمارت تیار ہوئی اور ایک انجن
 نصرۃ الاسلام قائم ہوئی اس کے ماتحت ایک اسکول اور ایک لائبریری
 کا افتتاح ہوا جس کا نام محمدن لائبریری ہے، میرا رسم تعارف اس اسکول
 اور اس لائبریری اور اسی کے ساتھ اس لائبریری کے روح رواں
 سید حیرن صاحب سے اسی زمانہ سے ہے یہ انجن جب قائم ہوئی تو میں نے
 سید صاحب کی طلب پر اپنے حقیقی برادر زادہ مولوی سید ابو ظفر صاحب
 ندوی کو جو اسی زمانہ میں تعلیم سے فارغ ہوئے تھے یہاں بھیجا تھا اور

انھیں کی کوشش اور مشورہ سے اس لائبریری نے جنم لیا تھا، اس کے بعد مولوی عسکد اباری صاحب ندوہ چھوڑ کر لکھنؤ سے سندھ فیصلت کے بجائے ہیوٹ انجینئرنگ اسکول کی سندے کریمیاں وارد ہوئے اور ۱۹۱۵ء میں اس لائبریری کے سکرٹری منتخب ہوئے اس وقت سے آج تک وہی حیثیت سے اس کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

محمدن لائبریری۔ لائبریری کی عمارت اچھی اور بڑی ہے، احاطہ بھی وسیع ہے اور سبزوں اور پھولوں سے بارونتی ہے ۱۹۱۵ء میں عمارت کی چند کتابوں کے سوا اس میں کچھ نہ تھا، سکرٹری صاحب کی کوشش سے اس میں سال بہ سال اضافہ ہوتا رہا یہاں تک کہ اب اس میں پانچ ہزار کتابوں کے قریب ہے، اردو کی تمام اچھی کتابیں اور اردو کے مشہور مصنفین کی تمام تصنیفات یہاں موجود ہیں فارسی اور عربی کی بھی کچھ کتابیں ہیں کسی قدر انگریزی کا بھی سرمایہ ہے کتابوں کی فن دار تعداد حسب ذیل ہے۔

مذہب و دینیات، تاریخ و سوانح، ناول اور افسانے، جغرافیہ اور سفر

۴۵۰ ۵۰۰ ۲۱۱۰ ۴۰

علمی و ادبی، متفرقات، کتب فارسی و عربی، کتب انگریزی۔

۴۴۰ ۴۰ ۳۵۰ ۴۳۰

قابل ذکر نئے اور پرانے علمی رسائل کی جلدیں بھی موجود ہیں اور وہ اس شمار میں شامل نہیں، روزانہ اخبارات اور ماہوار علمی رسالے بھی آتے ہیں۔

یہ کتابیں دہلی الماریوں میں قرینہ سے سجائی گئی ہیں۔

سولتانی زبان - ملتان کی ایک خاص زبان جی ہے جو پنجابی اور سندھی سے الگ ہے، ملتان کا علاقہ پنجاب اور سندھ کے بیچ میں واقع ہے اس لئے اس زبان کو ان دونوں کے بیچ کی کڑی سمجھ لیجئے۔

روانگی - ملتان میں میرا قیام تین روز رہا جن میں سے ایک آدھ دن علالت میں بھی گزرا چوتھے روز روانگی کا سامان ہوا، ابا بچے کے قریب ترین جاتی ہے، اسی پر سوار ہوا، احباب اسٹیشن تک پہنچانے آئے، گاڑی چلی تو پھر وہی ریگستان کا منظر تھا مگر جیسے جیسے آگے بڑھتے گئے، پنجاب کا سرسبز علاقہ آنے لگا، مغرب کے بعد لاہور آیا پہلے خیال تھا کہ ایک دو دن لاہور بھی ٹہروں مگر ملتان میں زیادہ ٹہر جانے کے سبب سے یہاں کے قیام کو ملتوی کیا۔

لکھنؤ - راستہ میں کوئی قابلِ ذکر بات پیش نہیں آئی لکھنؤ میں براہِ عزیز و محبت صمیم مولانا مسعود علی صاحب ندوی دارالعلوم میں تعمیر مسجد کے سلسلہ میں مقیم تھے ان کو تارکے ذریعہ اپنی آمد کی اطلاع دے دی تھی دوسرے دن دوپہر کے قریب گاڑی لکھنؤ پہنچی اسٹیشن پر مولانا مسعود علی صاحب اور ندوہ کے احباب واعزہ موجود تھے اتر کر دارالعلوم ندوہ کے اس صحنہ میں آیا، جو وہاں کی مسجد کی تعمیر کے سلسلے میں مسجد کے سامنے ہنایت سلیقے سے تیار ہوا تھا اور جس کو مولانا نے اپنی صفائی اور خوش سلیقگی سے ایسا بنا دیا تھا کہ کوٹھیوں اور بنگلوں والے آکر اس پر رشک کرتے

مسجد کی تعمیر جاری تھی 'مزدوروں اور سہاڑوں کا ہنگامہ برپا تھا ایک طرف آہنی جنگلوں کے لئے لوہاروں کا کام جاری تھا دوسری طرف ریل کی لمبی ٹرکیوں کے ذریعے ہر طرف مصنوعی نہر جاری تھی ندوہ کے اغوازی کارکن تعمیر کے امور متعلقہ کی انجام دہی کی غرض سے مولانا کے گرد و پیش حلقہ زن تھے درالعلوم کے طلبہ افغانستان کے حالات اور اپنے افغان بھائیوں کی ترقیوں کی روداد سننے کو آتے رہے، قندھار کے انار اور انگوڑی جسات آئے تھے وہ ان عزیزوں کو تحفے کے طور پر بیسویں ہی دن گزر گیا، اور رات آئی، ۷ نومبر کی صبح تھی افغانستان کے سفر کی مستی کا خمار ہنوز چھایا ہوا تھا۔

نادر شاہ کی شہادت

کہ یک بیک صبح کو ایک دوست نے آکر اطلاع دی کہ شاہ افغان نادر خاں نے شہادت پائی یہ ایسی خبر تھی کہ جس کے ماننے کو دل تیار نہ ہوا، ندوہ کے بعض عزیزوں کو سائیکل پر اخبارات کے دفتر میں بھیجا، دس بجے کے قریب خبر یقین کے درجے کو پہنچ گئی، اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میں نے پچھلے چند ہفتے ایسے تماشے کی سیر میں گزارے جس کا خاتمہ ٹریسڈی پر ہوا۔

مسافر از ڈاکٹر اقبال

کیا عجیب اتفاق ہے، آج، ۷ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو جب اس داستان سفر کی آخری سطر سے میں نے فراغت پائی ہے ڈاکٹر کے قاصد نے

ڈاکٹر سر محمد اقبال کی تالیف ”مسافر“ ہاتھ میں دی یہ افغانستان کی
چند روزہ سیاحت پر موصوف کے شاعرانہ جذبات کا مجموعہ ہے جو
ابھی شائع ہوا ہے، فارسی زبان میں خیبر و سرحد و کابل و غزنین و
قندھار کے عبرت انگیز مناظر و مقابر پر شاعر کے آنسو ہیں اور بابر
سلطان محمود حکیم سنائی اور احمد شاہ درانی کی خاموش تربتوں کی
زبانِ حال سے سوال و جواب ہیں مسافر کا آغاز نادور شاہ شہید کے
مناقب سے اور اختتام شاہ محمد ظاہر خاں سے انہارِ قوت سے
پر ہے، کہتا ہے۔

خطاب بہ شاہ ظاہر خاں

اے قبائے بادشاہی بر تو راست
سایہ تو خاک مارا کیمیا است
از تو اے سرمایہ فتح و ظفر
تحت احمد شاہ راشد نے دگر
حرف شوق آوردہ ام از من پذیر
از فقیرے رمز سلطانی بگسیر
ہر کہ خود را صاحب امور کرد
گرد او گردد سپہر گرد گرد

دو جهان رنگ و نور را آبر و سلامت
 دوش از و امروز از و فردا از و است
 مرد حق سرمایه روز و شب است
 زانکه او تقدیر خود را کوکب است
 سرگزشت آل عثمان را انگر
 از فریب غریباں خویش جگر
 ذکر و فکر نادری در خون تست
 قاهری با دلبری در خون تست
 اے فروغ دیده بر ناو پیر
 ستر کار از لم شتم و محمود گیر
 هم از اں مردے که اندر کوه و دشت
 حق از تیغ او بلند آواز هگشت
 روز با شب با پدیدن می توان
 عصر دیگر آفریدن می توان
 صد جهان با قیست در قرآن هنوز
 اندر آیا تشنیک خود را بسوز
 با ز افغان را از و سوزے بده
 عصر او را صبح نوروزے بده

